اے مُسلم

اے مُسلم پریشاں، اے صد فاقہ مستی — بودی بہ اوجِ رفعت، حالا توز یر دستی

اے محوِ خود پرستی، آئینہ دار ہستی — شانت فلک نماؤ تو در حضیضِ پستی!

دنیا نوائے چنگ و بربط شکست لیکن — وقفِ خمار مستی، مصروف خواب ہستی

پیمانِ حق پرستی، وادی بجان و دلہا! — امروز اے مُسلماں، آں عہد را شکستی

پرواز شاہبازے دادہ بتو خداوند — لیکن نصیب اعدا خود بال و پر گسستی

آں باغ و لالہ زارے، آں فصل زرنگارے — تاراج شد بہارے، اما تو صرف مستی

صبح بہار خنداں، جلوہ فزا درخشاں — اے کرمک پریشاں، تا چند شب پرستی

پیمانۂ عمل را لبریز کن خدا را! — بگزر ز عیش رنگیں، بگزار کیف و مستی

تو کیستی خدا را؟ عرفان حال خود کن — مانند روح اعظم، در کائنات ہستی

از مہر عشق تاباں پرنور روح و دل کن — تا جلوہ بار باشی در تیرہ زار ہستی

از حلقۂ غلامی، از ذلت دوامی

آزاد باش عامی رو در مقام سامی

وجدی الحسینی

گرد و پیش!

مجاہد ریف!

بیسویں صدی کا وہ مرد مجاہد جس نے اپنی بے سروسامانی اور کم مائگی کے باوجود اسپین کی جابر و استعمار پسند حکومت سے مسلمانان ریف کی غلامی کے لئے جنگ کی اور اس کی سلطنت کو ناک چنے چبوا دیئے، یورپ کی تمام اسلام دشمن قوموں کی متحدہ تہدید کی بدولت جزیرہ موریشس میں قید کر دیا گیا۔ اس مجاہد اسلام کو فرانسیسی زندان میں ظلم و ستم سہتے آج بیس سال ہو چکے ہیں۔ دنیا میں کیا کیا انقلاب آئے اور تغیرات ہو گئے۔ مگر اسلام کا یہ ہیرو دنیا کے مسلمانوں کے تغافل اور بے توجہی کی بدولت اس عالم پیری میں زندگی کی آخری گھڑیاں گن رہا ہے۔ کہنے کو آج دنیا میں متحدہ اقوام کی سکیورٹی کونسل بھی ہے، عربوں کی لیگ اور ہندیوں کی مسلم لیگ بھی ہے۔ مگر کسی کو اتنی توفیق نہیں کہ مذہب کے نام پر نہیں انسانیت ہی کی خاطر اس ضعیف لاچار بین الاقوامی شخصیت کو نجی استبداد سے رہائی دلائے۔ ہم پھر دنیا کے تمام مسلمانوں، عرب، ترکی، مصر اور افغانستان کی حکومتوں اور اسلامی انجمنوں سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ غازی موصوف کی رہائی کے لئے متحدہ اقوام پر پورا زور ڈالیں۔ اور اپنے نام سے اخوت کشی کا دھبہ دور کریں۔

سدھار!

خوشی کی بات ہے کہ کانگریسی وزارتوں نے عہدے سنبھالتے ہی مفاد عامہ کی بعض تجویزوں پر عملدرآمد شروع کر دیا ہے اور بہت سی مفید عام تجاویز زیر غور ہیں۔ اس سلسلے میں حکومت بمبئی نے رشوت ستانی کے انسداد و استیصال کی مہم پوری تیاریوں سے شروع کر دی ہے۔ صوبہ بہار میں جیلوں اور قیدیوں کی رہائش اور قیام کا انتظام درست کیا جا رہا ہے۔ یو۔پی میں چھوٹے بچوں کو تازہ اور خالص دودھ رعایتی قیمت پر سپلائی کرنے کا انتظام کیا گیا ہے۔ اسی طرح مدراس میں غذائی حالت سدھار کا پروگرام غور و خوض سے بنایا جا رہا ہے۔

چنانچہ ان جمہوری وزارتوں کی مسلم آزار پالیسی قابل نفرت و ترک ہے وہاں ان کے یہ مفید انسانیت اور نافع خلائق کارنامے لائق تحسین و تبریک ہیں۔ کاش کہ یہ حکومتیں قومی عصبیت اور فرقہ پرستی کے دھارے میں نہ بہیں۔ اور مفاد عام کے ہر کام میں پوری رواداری سے کام لیں۔ ماضی کے تجربات جہاں حکومت بمبئی کے امتناع منکرات (بندش شراب وغیرہ) کے عدیم المثال قانون کو رحمت بتاتے ہیں وہاں یو۔پی اور سی۔پی میں دور نانیت کو لعنت تصور کرتے ہیں۔ ہم امید کرتے ہیں کہ موجودہ صوبائی حکومتیں اس افراط و تفریط سے اپنے دامن کو بچا لیں گی۔ اور آسام کی ننگ انسانیت پالیسی کی مذمت کرتے ہوئے اپنے صوبوں میں حریت و مساوات کا علم سرنگوں نہ ہونے دیں گی۔

بلدیہ بھوپال!

خیال تھا موجودہ الیکشن کے بعد جو قابل و لائق ہستیاں میونسپل بورڈ میں پہنچی ہیں وہ ان شرمناک اور تکلیف دہ امور کی یقیناً اصلاح کریں گی جن کی وجہ سے عرصہ تک اہل شہر ضیق میں رہے۔ مگر دیکھا یہ جا رہا ہے کہ میونسپل ہال آباد تو ضرور ہو گیا مگر شہر کی سڑکوں اور گلیوں میں کیچڑ کا وہی لاوا اب بھی موجود ہے۔ نالیوں کی گندگی اور کیچڑ کی تعفن اب بھی راحت مشام بنا ہوا ہے۔ پانی کا گدلا پن، مچھروں اور مکھیوں کا زہر ہلاہل اب بھی حلق سے اتارا جا رہا ہے۔

ممبران خواہ وہ انڈیپنڈنٹ ہوں یا جماعتی نمائندے ان سب کا سب سے پہلا اور اولین فرض یہ ہے کہ وہ اپنے فرائض کو نہ بھولیں۔ اور اپنے انتخاب کنندگان کو پشیمانی اور ندامت کا موقع نہ دیں۔

ایک مستحسن اقدام!

ان دنوں مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن بھوپال کا اشتہار نظر سے گذرا۔ معلوم ہوا ہے یہ جماعت بھوپال میں پہلے سے موجود تھی۔ لیکن عام طور پر مسلمانوں کی دوسری چھوٹی جماعتوں کی جو حالت ہوتی ہے طلبہ کی یہ جماعت بھی اسی طرح خواب خرگوش میں سوتی پڑی رہی۔ گویا وجود و عدم برابر تھا۔ یہ لیکن یہ خبر مسرت سے سنی جائے گی کہ اب اس کی قیادت ایسے طلبہ کے ہاتھ میں آگئی ہے جن کی ہمت سے بہت کچھ صحیح عمل کی توقع ہے۔ قوم و ملک کے مخلص افراد یہ سن کر خوش ہوں گے کہ جو پروگرام اور دستور العمل طلبہ اور قوم کے ان نونہالوں کے لئے قوم کے رہنماؤں کو بنانا چاہیے تھا، طلبہ کی اس جماعت نے از خود ان باتوں کو اپنا نصب العین بنایا ہے۔ جماعت نے اپنے ممبران کیلئے یہ ضروری قرار دیا ہے کہ وہ نماز روزہ کے پابند ہوں، اسلامی علوم اور اسلامی تاریخ سے خود بھی دلچسپی رکھیں۔ اور اپنے بھائیوں کو بھی زیادہ سے زیادہ اس کی رغبت دلائیں۔ ہمیں بڑی خوشی ہوگی اگر طلبہ کے قائدین اس تبلیغ کا بھی خیال رکھیں جس کی وجہ سے آج ہمارا قومی شیرازہ پراگندہ ہے۔ بدزبانی، بدگوئی، اور غیبت سب سے برا اور برا مرض ہے۔ اسلامی تاریخ اور اسلامی علوم ہمارے نزدیک حقیقی معنوں میں کوئی حقیقت نہیں رکھتے۔ اگر ان پر عبور حاصل کرنے کے بعد بھی ہماری روح کی اصلاح نہ ہو، تعلیم کے بعد بھی اگر ہمارے دل خباثت سے پر ہوں تو ایسی مذہبی تعلیم سے جہالت ہزار درجہ بہتر ہے۔ بہرحال خدا کرے کہ قوم کا یہ نونہال طبقہ اس کمی کو بھی پورا کرے۔

زندہ باد ساگر!

آج جبکہ ہندوستان کے بڑے بڑے شہر اور صوبے کالج اور یونیورسٹیوں سے خالی ہیں، سی۔پی کے ایک چھوٹے سے شہر میں یونیورسٹی کا قیام مسرت اور حیرت کا باعث ہے، مبارک ہیں وہ لوگ جن کی سعی و کاوش سے یہ سرچشمۂ علم جاری ہوا۔ کیا بھوپال گورنمنٹ اپنے اس ہمسایہ شہر سے تھوڑا سا احساس مستعار لے گی؟

جلد ۱ جمعہ ۵ جولائی ۱۹۴۶ء مطابق ۵ شعبان ۱۳۶۵ھ نمبر ۲

صبح امید!

غلامی ام المصائب اور دنیا کی سب سے بڑی لعنت ہے۔ بدقسمتی سے گذشتہ ۲ صدی سے مشرق کے بیشتر ملک جو تقریباً تمام اسلامی منطقے ہیں اس لعنت میں مبتلا ہیں۔ محکومی و زیردستی نے ان سبکو محاسن سے عاری اور برائیوں کا خوگر بنا دیا۔ لیکن جب مصائب اور تکالیف کی انتہا ہو گئی تو اپنی بیچارگی کا مبارک احساس شروع ہوا۔ اور آج مقام مسرت ہے، کہ اقوام مشرق اپنی کھوئی ہوئی حریت اور آزادی کے حصول کے لئے سر بکف میدان میں اتر آئی ہیں۔ ان محکوم اقوام میں سب سے اہم اور عظیم ہندوستانی قوم ہے جس کی آزادی کی جدوجہد اقلیت اور اکثریت کے مسئلہ میں الجھ کر ہمیشہ ناکام ہوتی رہی۔ یہ صحیح ہے کہ ہندوستان مختلف النسل اور متعدد العقائد تہذیبوں کا گہوارہ ہے۔ لیکن اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ تمام قومیں ایک ہی فرنگی اقتدار کی مشق ستم ہیں اور ایک واحد جدوجہد سے ان سب کی خلاصی بآسانی ممکن ہے۔ گذشتہ ۶ ماہ میں جو چند اجتماعی مظاہرے کئے گئے ان کے نتیجہ کے طور پر بڑی قوموں کیلئے اپنے اقتدار کی گرفتیں ڈھیلی کرنا ضروری ہو گیا۔ اور آج برطانیہ عظمیٰ ببانگ دہل یہ اعلان کرنے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتی کہ خواہ کچھ بھی ہو قابل اعتماد ہندوستانیوں پر مشتمل ایک گورنمنٹ ضرور بنائی جائے گی۔ "ہندوستان پر حکومت کرنیکا حق ہندوستانیوں کو ہی ہے۔" "ہم سے اس سلسلے میں جو کچھ ہو سکے گا پوری اعانت کریں گے۔"

جہاں تک نئے آئین کا تعلق ہے کانگریس اور مسلم لیگ دونوں اپنی رضامندی کا اظہار کر چکی ہیں صرف عارضی حکومت میں کانگریس حصہ نہیں لے گی۔ اسطرح جو حالات پیدا ہوگی اس کے لئے مسلم لیگ اور ان نمائندوں کا جو انفرادی حیثیت سے عارضی گورنمنٹ میں لئے جائیں، یہ فرض ہوگا کہ وہ زیادہ سے زیادہ عوام کی خوشنودی حاصل کریں۔ اور اپنے امکان بھر ان بوجھل ٹیکسوں اور پابندیوں کو یکلخت منسوخ کریں جو ہندوستانیوں کی ترقی اور خوشحالی میں سنگ راہ بنی ہوئی ہیں۔ حاکموں کی رعونت، افسروں کی انانیت اور محکموں کے تغافل کو ہمیشہ کے لئے دفن کر دیں۔ اقتصادی بدحالی، مفلسی، بیروزگاری، بھیک اور مفت خوری کا منظم سدباب کریں۔ اور ہندوستان کے جوہر کو علم و اختراع، اخلاق و تہذیب اور مذہب و تمدن کے میدان میں کھلنے کا پورا موقع دیں۔ اور ان کی ہمت افزائی کریں۔ صرف یہی وہ طریقہ ہے جس پر چل کر ایک ملی جلی حکومت عوام میں مقبولیت اور اعتماد حاصل کر سکتی ہے۔ ہندو نمائندے مسلمانوں کی اصلاح و بہبود کے کاموں میں اسی سرگرمی سے حصہ لیں جیسا کہ وہ خود اپنی قوم کے لئے چاہتے ہوں۔ اسی طرح مسلمان جہاں اپنی ملت کی مذہبی، اقتصادی، اور تعلیمی بہتری میں پرخلوص طریقہ پر کوشاں ہوں، اپنے ہموطنوں کی خیر سگالی میں بھی کوئی گریز نہ کریں۔ ہر صوبہ میں خواہ وہ لیگ گروپ "ا" کا ہو یا بی اور سی کا، ہر فرد یکساں برتاؤ کا مستحق سمجھا جائے۔ مسلم ممبران کی خلائق عامہ کی بہتری کے علاوہ یہ ذمہ داری بھی ہے کہ وہ مسلمانوں کی اصلاح میں دنیا کی دیگر قوموں سے خود ساختہ نعمت العیون کے برعکس ملی نقطۂ نظر کو سامنے رکھ کر وہ حدود شرائع نافذ کریں جو رد و قدح سے بالاتر ہیں۔

ہندوستان کے بعد دوسرے محکوم ایشیائی اور افریقی ممالک، فلسطین، لیبیا، مراکو، الجیریا اور طرابلس ہیں۔ ان میں فلسطین اپنی جدوجہد آزادی میں سب سے پیش پیش ہے۔ لیکن برطانیہ اور امریکہ جیسی دو بڑی سلطنتوں کے مقابلہ میں اس کی کامیابی ناممکن ہے اس کے لئے ضروری ہے کہ ساری مسلم سلطنتوں کا ایک بلاک بنایا جائے۔ اور ایسا بلاک نہ صرف یہ کہ مسئلہ فلسطین کو ہمیشہ کے لئے سلجھا دیگا بلکہ وہ دوسرے محکوم ممالک کو بھی یورپین استعمار سے نجات دلا سکیگا۔ اگر ایسا محاذ قائم نہ کیا گیا تو وہ ملک جو اسوقت آزاد یا نیم آزاد ہو کر بھی بے وقعت ہیں ہمیشہ تین بڑوں کے ہاتھوں میں کھلونا بنے رہینگے اور تا قیامت اپنی کوئی بات بھی نہ منوا سکیں گے۔ ترکی ہو یا افغانستان، مصر ہو یا ایران حقیقی آزادی کی نعمت سے ابھی کوسوں دور ہیں۔ ان کا وجود اقوام غالبہ کی نظر کرم ہے اور

قابلِ تقلید ہستیاں!

شاہ ولی اللہ صاحب مرحوم

"ادارہ"

شاہ ولی اللہ صاحب ۲۱ فروری ۱۷۰۳ء کو اورنگ زیب کی وفات سے چار سال پہلے پیدا ہوئے، یہ سیاسی طور پر اسلام کے زوال اور تنزل کا زمانہ ہے لیکن مذہبی اور علمی نقطۂ نظر سے اصلاح اور تجدید کا زمانہ بھی یہی ہے۔

شاہ صاحب کا سلسلۂ نسب والد کی طرف سے حضرت عمرؓ اور والدہ کی طرف سے حضرت امام موسیٰ کاظمؒ تک پہنچتا ہے۔ آپ کے ایک بزرگ حضرت شیخ شمس الدین مفتی صاحب، اسلامی حکومت کے آغاز ہی میں ہندوستان آگئے، اور بمقام رہتک مقیم ہوئے۔ شروع میں ان کا خاندان علم و فضل میں ممتاز تھا۔ لیکن ایک بزرگ حضرت شیخ محمود نے منصب قضا کو چھوڑ کر سپاہیانہ زندگی شروع کر دی۔ اس کے بعد ایک عرصہ تک یہ خاندان دلیری اور بہادری کے لئے مشہور رہا۔ آپ کے دادا شیخ وجیہ الدین صاحب، صاحبِ سیف و قلم تھے، شاہ صاحب کے والد نے قرآن کریم انہیں سے پڑھا تھا۔ لیکن شیخ وجیہ الدین صاحب کی اصل شہرت بطور ایک بہادر سپاہی کے ہے، وہ اورنگ زیب کے لشکر میں سردار تھے۔ جب کھجوہ کے مقام پر اورنگ زیب اور شاہ شجاع میں مقابلہ ہوا تو وہ ان چند باہمت، وفادار سرداروں میں سے تھے جو اُس وقت ثابت قدم رہے تھے۔ جب شاہ شجاع کے مست ہاتھیوں نے اودھم مچا رکھا تھا۔ اور تمام لشکر تتر بتر ہو رہا تھا۔

شاہ صاحب کے والد شاہ عبدالرحیم صاحب نے تلوار چھوڑ کر کتاب سنبھالی، آپ ۱۰۵۴ھ (۱۶۴۴ء) میں پیدا ہوئے، تعلیم گھر پر حاصل کی، تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد آپ نے "مہندیوں" کے نزدیک "مدرسہ رحیمیہ" قائم کر کے درس و تدریس میں مشغول ہو گئے، آپ کا شمار اپنے زمانہ کے مشہور علمائے کرام میں ہوتا ہے اور اس کمیٹی کے رکن تھے جو عہد عالمگیری میں فتاویٰ عالمگیری کی تدوین و تعمیر کے لئے مقرر ہوئی تھی، شاہ صاحب ایک جگہ آپ کے متعلق فرماتے ہیں، میں نے ایک شخص بھی ایسا نہیں دیکھا جو عام علوم میں عموماً اور فقہ و حدیث میں خصوصاً ان کی مہارت رکھتا ہو۔ آپ کی وفات ۷۷ سال کی عمر میں ۱۱۳۱ھ میں ہوئی جبکہ شاہ صاحب کی عمر صرف سترہ سال کی تھی۔

شاہ صاحب کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی، پانچ سال کی عمر میں آپ نے مکتب جانا شروع کیا۔ دو سال میں قرآن پڑھا، اور ساتویں سال سے نماز روزہ کی پابندی شروع کی، پھر فارسی کی کتابیں اور عربی رسالے پڑھے، دس سال کی عمر میں شرح جامی شروع کی۔ اور پندرہ سال کی عمر میں شاہ عبدالرحیم صاحب نے آپ کو سلسلہ نقشبندیہ میں بیعت کیا، اس کے دو سال بعد والد مرحوم کا انتقال ہو گیا، تو سترہ سال کی عمر میں آپ کو مسند سنبھالنی پڑی۔ ۳۰ سال کی عمر میں آپ عرب تشریف لے گئے، دو مرتبہ فریضہ حج ادا کیا۔ اور حدیث جسے آپ نے ہندوستان میں مولانا محمد افضل سیالکوٹی سے پڑھا تھا، اس کی سند شیخ ابو طاہر مدنی سے لی، شیخ ابو طاہر ابن ابراہیم بھی شاہ صاحب کے بڑے مداح تھے، اور کہا کرتے تھے کہ ولی اللہ مجھ سے الفاظ کی سند لیتے ہیں، اور میں ان سے معانی کی، شیخ محمد بن عبدالوہاب اسی زمانے میں بطور طالب علم مدینے میں آئے ہوئے تھے، یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ شاہ صاحب سے ان کی ملاقات ہوئی۔ لیکن غالب گمان یہ ہے کہ کئی ایسے لوگ ہوں گے جنہیں اسلام کی نشأۃ ثانیہ کے دونوں رہنما جانتے ہوں گے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ دونوں کے استاد ایک ہوں۔ شاہ صاحب یکم جنوری ۱۷۳۲ء کو واپس دہلی تشریف لائے۔ اور مدرسہ رحیمیہ میں درس و تدریس اور تصنیف و تالیف میں مشغول ہو گئے۔ آپ کا یہ مشغلہ آخر زندگی تک جاری رہا۔ وفات ۱۱۷۶ھ (۱۷۶۲ء) میں دہلی میں ہوئی۔

مولانا شبلیؒ "تاریخ علم الکلام" میں لکھتے ہیں "ابن تیمیہ" اور "ابن رشد" کے بعد، بلکہ خود انہیں کے زمانے میں مسلمانوں میں جو عقلی تنزل شروع ہوا تھا، اس کے پیش نظر یہ امید نہ رہی تھی کہ پھر کوئی صاحب دل و دماغ پیدا ہوگا۔ لیکن قدرت کو اپنی نیرنگیوں کا تماشا دکھانا تھا کہ آخر زمانے میں جبکہ اسلام کا نفس واپسیں تھا، حضرت شاہ ولی اللہ صاحب جیسا شخص پیدا ہوا جس کی نکتہ سنجیوں کے آگے غزالی، رازی، اور ابن رشد کے کارنامے ماند پڑ گئے۔

مرحوم نواب صدیق حسن خان نے آپ کے متعلق لکھا ہے کہ اگر آپ پہلے زمانے میں پیدا ہوتے تو آپ اماموں کے امام سمجھے جاتے، جہاں تک علمی تبحر، ذاتی قابلیت، مجتہدانہ جد و جہد، اور اشاعت کتاب و سنت کا تعلق ہے، دنیائے اسلام میں بہت کم بزرگ ہوئے جن سے شاہ صاحب پیچھے رہتے ہوں۔ مختلف علوم و فنون، تفسیر، حدیث، فقہ، تصوف، علم الکلام پر آپ نے متعدد کتابیں لکھیں۔ خدا تعالیٰ نے آپ کو وہ ذکاوت اور ذہانت عنایت کی تھی جو بڑے سے بڑے عالم کیلئے بھی قابل رشک تھی،

آپ کی سب سے اہم خدمت اور قابل تقلید کام قرآن کریم کی اشاعت ہے۔ اس سلسلہ میں آپ کا سب سے نمایاں کارنامہ قرآن مجید کا فارسی ترجمہ ہے ہندوستان میں عربی بہت کم سمجھی جاتی تھی۔ فارسی دفتری اور تعلیمی زبان تھی، لیکن اس زبان میں قرآن کریم کا کوئی ترجمہ نہ تھا، چنانچہ عام مسلمان گلستان، بوستان وغیرہ تو پڑھتے تھے لیکن قرآن مجید سے، جو ہدایات کا سرچشمہ تھا ناواقف تھے، بجز اپنے علماء اور خواص میں سے قرآن کریم اگر کسی نے پڑھا بھی تو ناظرہ، یعنی مفہوم و معانی اور اس کی روح اور تعلیمات سے فیضیاب ہوئے بغیر، چنانچہ شاہ صاحب کو اس بوالعجبی کا احساس ہوا۔ اور ۱۷۳۷ء میں آپ نے کلام مجید کا ترجمہ فارسی زبان میں کیا، جب علماء کو اس کا پتہ چلا تو تلواریں کھینچ کر آگئے کہ یہ قرآن کریم کی انتہائی بے ادبی ہے۔ بعض مورخین اور سوانح نگار لکھتے ہیں کہ ان کی مخالفت کی وجہ سے حضرت

(باقی صفحہ ۱۵ پر)

اسلامی قومیت

مولانا ابوالاعلیٰ صاحب مودودی

وحشت سے مدنیت کی طرف انسان کا پہلا قدم اٹھتے ہی ضروری ہوجاتا ہے کہ کثرت میں وحدت کی ایک شان پیدا ہو اور مشترک اغراض و مصالح کے لئے متعدد افراد آپس میں مل کر تعاون اور اشتراک عمل کریں۔ تمدن کی ترقی کے ساتھ ساتھ اس اجتماعی وحدت کا دائرہ بھی وسیع ہوتا چلا جاتا ہے یہاں تک کہ انسانوں کی ایک بڑی تعداد اس میں داخل ہوجاتی ہے۔ اسی مجموعۂ افراد کا نام "قوم" ہے۔ اگرچہ لفظ "قوم" اور "قومیت" اپنے مخصوص اصطلاحی معنوں میں حدیث العہد ہیں۔ مگر جس معنے پر ان کا اطلاق ہوتا ہے، وہ اتنا ہی قدیم ہے جتنا کہ خود تمدن قدیم ہے۔ "قوم" اور "قومیت" جس ہیئت کا نام ہے، وہ بابل، مصر، روم اور یونان میں بھی ویسی ہی تھی جیسی آج فرانس، انگلستان، جرمنی اور اٹلی میں ہے۔

قومیت کے غیر منفک لوازم اس میں شک نہیں کہ قومیت کی ابتدا ایک معصوم جذبہ سے ہوتی ہے یعنی اس کا مقصد اول یہ ہوتا ہے کہ ایک خاص گروہ کے لوگ اپنے مشترک مفاد و مصالح کے لئے مل کر عمل کریں، اور اجتماعی ضروریات کے لئے ایک "قوم" بن جائیں، لیکن جب ان میں "قومیت" پیدا ہوجاتی ہے تو لازمی طور پر "عصبیت" کا رنگ اس میں آجاتا ہے، اور جتنی جتنی "قومیت" شدید ہوتی جاتی ہے، اسی قدر "عصبیت" میں بھی شدت بڑھتی چلی جاتی ہے۔ جب کبھی ایک قوم اپنے مفاد کی خدمت اور اپنے مصالح کی حفاظت کے لئے اپنے آپ کو ایک رشتۂ اتحاد میں منسلک کرے گی یا بالفاظ دیگر اپنے گرد قومیت کا حصار کھینچ لے گی تو لازماً وہ اس حصار کے اندر اور باہر والوں کے درمیان اپنے اور غیر کا امتیاز کرے گی۔ اپنے کو ہر معاملہ میں غیر پر ترجیح دے گی۔ غیر کے مقابلہ میں اپنی ہی کی حمایت کرے گی جب کبھی دونوں کے مفاد و مصالح میں اختلاف واقع ہوگا تو وہ اپنے مفاد کی حفاظت کرے گی اور اس پر غیر کے مفاد کو قربان کردے گی۔ انہی وجوہ سے ان میں صلح کبھی ہوگی اور جنگ بھی۔ مگر رزم اور بزم دونوں میں قومیت کی حد فاصل دونوں گروہوں کے درمیان قائم رہے گی۔ اسی چیز کا نام عصبیت وحمیت ہے۔ اور قومیت کی یہ وہ لازمی خصوصیت ہے جو اس کے ساتھ پیدا ہوتی ہے۔

قومیت کے عناصر ترکیبی قومیت کا قیام وحدت و اشتراک کی کسی ایک جہت سے ہوتا ہے خواہ وہ کوئی جہت ہو۔ البتہ شرط یہ ہے کہ اس میں ایسی زبردست قوت رابطہ و ضابطہ ہونی چاہیے کہ اجسام کے تعدد اور نفوس کے تکثر کے باوجود وہ لوگوں کو ایک کلمہ، ایک خیال، ایک مقصد اور ایک عمل پر جمع کردے، قوم کے مختلف اور کثیر التعداد اجزاء کو قومیت کے تعلق سے اس طرح بستہ و پیوستہ کردے کہ وہ سب ایک ٹھوس چٹان بن جائیں، اور افراد قوم کے دل و دماغ پر اتنا غلبہ و تسلط حاصل کرے کہ قومی مفاد کے معاملہ میں وہ سب متحد ہوں اور ہر قربانی کے لئے آمادہ رہیں۔

یوں تو اشتراک اور وحدت کی جہتیں بہت سی ہونی ممکن ہیں، لیکن آغاز عہد تاریخ سے آج تک دنیا میں جتنی قومیتیں بنی ہیں، ان سب کی تعمیر بجز ایک اسلامی قومیت کے، حسب ذیل اشتراکات میں سے کسی ایک قسم کے اشتراک پر ہوئی ہے اور اس عنصر کے ساتھ چند دوسرے اشتراکات بھی بطور مددگار کے شریک ہوگئے ہیں۔

اشتراک نسل جس کو "نسلیت" کہتے ہیں۔

اشتراک مرز و بوم جس کو "وطنیت" کہتے ہیں۔

اشتراک زبان جو وحدت خیال کا ایک زبردست ذریعہ ہونے کی وجہ سے قومیت کی تعمیر میں خاص حصہ لیتا ہے۔

اشتراک رنگ جو ایک رنگ کے لوگوں میں ہم جنسی کا احساس پیدا کرتا ہے اور پھر یہی احساس ترقی کرکے انکو دوسرے رنگ کے لوگوں سے احتراز و اجتناب پر آمادہ کردیتا ہے۔

معاشی اغراض کا اشتراک جو ایک معاشی نظام کے لوگوں کو دوسرے معاشی نظام والوں کے مقابلہ میں ممتاز کرتا ہے۔ اور جس کی بنا پر وہ ایک دوسرے کے مقابلہ میں اپنے معاشی حقوق و منافع کے لئے جدوجہد کرتے ہیں۔

نظام حکومت کا اشتراک جو ایک سلطنت کی رعایا کو اس کی وفاداری کے رشتہ میں منسلک کرتا ہے، اور دوسری سلطنت کی رعایا کے مقابلہ میں حد فاصل قائم کردیتا ہے۔

قدیم ترین عہد سے لیکر آج بیسویں صدی کے روشن زمانے تک جتنی قومیتوں کے عناصر اصلیہ کا آپ تجسس کریں گے۔ ان سب میں آپ کو یہی مذکورہ بالا عناصر ملیں گے۔

اب سے دو تین ہزار برس پہلے کی یونانیت، رومیت، اسرائیلیت، ایرانیت وغیرہ بھی انہی بنیادوں پر قائم تھیں جن پر آج کی المانیت، فرانسیسیت انگریزیت، جاپانیت وغیرہ قائم ہیں۔

شر اور فساد کا سرچشمہ یہ بالکل صحیح ہے کہ یہ بنیادیں جن پر دنیا کی مختلف قومیتیں تعمیر کی گئی ہیں، انھوں نے بڑی قوت کے ساتھ جماعتوں کی شیرازہ بندی کی ہے مگر اس کے ساتھ یہ حقیقت بھی ناقابل انکار ہے کہ اس قسم کی قومیتیں بنی نوع انسانی کے لئے ایک شدید مصیبت ہیں، انہوں نے عالم انسانی کو سینکڑوں ہزاروں حصوں میں تقسیم کردیا ہے۔ اور حصے بھی ایسے کہ ایک حصہ فنا کیا جاسکتا ہے۔ مٹا دیا جاسکتا ہے۔ مگر دوسرے حصہ میں کسی طرح تبدیل نہیں کیا جاسکتا۔ ایک نسل دوسری زبان کے بولنے والے نہیں بن سکتے ایک رنگ دوسرا رنگ نہیں بن سکتا ایک قوم کی معاشی اغراض بعینہ دوسری قوم کی معاشی اغراض نہیں بن سکتیں ایک سلطنت کبھی دوسری سلطنت نہیں بن سکتی۔ نتیجہ یہ ہے کہ جو قومیتیں ان بنیادوں پر تعمیر ہوتی ہیں، ان کے درمیان مصالحت کی کوئی سبیل نہیں نکل سکتی۔ قومی عصبیت کی بنا پر وہ ایک دوسرے کے خلاف مسابقت، مزاحمت اور منافست کی ایک دائمی کشمکش میں مبتلا رہتی ہیں۔ ایک دوسرے کو پامال کرنے کی کوشش کرتی ہیں آپس میں لڑلڑ کر فنا ہوجاتی ہیں اور پھر انہی بنیادوں پر دوسری قومیتیں ایسی

بھگت برپا کرنے کے لئے اٹھ کھڑی ہوتی ہیں۔ یہ دنیا میں فساد، بدامنی، اور شرارت کا ایک مستقل سرچشمہ ہے۔ مدنیت کی سب سے بڑی دشمن ہے، شیطان کا سب سے زیادہ کامیاب حربہ ہے جس سے وہ اپنے ازلی دشمن انسان کا شکار کرتا ہے۔

عصبیت جاہلیہ اس قسم کی قومیت کا فطری اقتضاء یہ ہے کہ وہ انسان میں جاہلانہ عصبیت پیدا کرے۔ وہ ایک قوم کو دوسری قوم سے حقارت کرنے اور نفرت برتنے پر صرف اس لئے آمادہ کرتی ہے کہ وہ دوسری قوم کیوں ہے؟ اسے حق، صداقت، اور انصاف سے سروکار نہیں ہوتا۔ صرف یہ بات کہ ایک شخص غیر ہے، دوسرے کی نظر میں اسے حقیر بنا دیتی ہے۔ صرف اتنی سی بات کہ ایک انسان اطالوی ہے، فرنگی کی نفرتوں، جابرانہ دراز دستیوں، اور حق تلفیوں کو اس کے لئے وقف کر دیتی ہے۔ آئن شائن جیسے فاضل کا اسرائیلی ہونا اس کے لئے کافی ہے کہ المانی اس سے نفرت کرے۔ حبشیوں کا محض سیاہ فام حبشی ہونا اس کو جائز کر دیتا ہے کہ ایک یورپین کو سزا دینے کے جرم میں اس کی ریاست چھین لی جائے۔ امریکہ کے مہذب باشندوں کے لئے یہ قطعاً جائز ہے کہ وہ حبشیوں کو پکڑ کر زندہ جلا دیں کیونکہ وہ حبشی ہیں۔ المانی کا المانی ہونا اور فرانسیسی کا فرانسیسی ہونا اس بات کے لئے بالکل کافی ہے کہ دونوں آزاد ہے۔ افغانیوں کا افغانی ہونا اور دمشق کے باشندوں کا عرب ہونا انگریز اور فرانسیسی کو اس کا پورا حق بخش دیتا ہے کہ وہ ان کے سروں پر طیاروں سے گولے برسائیں اور ان کی آبادیوں کا قتل عام کریں خواہ یورپ کے مہذب شہریوں پر اس قسم کی گولہ باری کتنی ہی وحشیانہ حرکت سمجھی جاتی ہو۔ غرض یہ جنسی امتیاز وہ چیز ہے جو انسان کو حق اور انصاف کی طرف سے اندھا بنا دیتی ہے، اور اس کی وجہ سے عالمگیر اصول اخلاق و شرافت بھی قومیتوں کے قالب میں ڈھل کر کہیں ظلم اور کہیں عدل، کہیں سچ اور کہیں جھوٹ، کہیں کمینگی اور کہیں شرافت بن جاتے ہیں۔

کیا انسان کے لئے اس سے زیادہ غیر معقول ذہنیت اور کوئی ہو سکتی ہے کہ وہ ایک نالائق بدکار اور شریر آدمی کو ایک لائق، صالح اور نیک نفس آدمی پر صرف اس لئے ترجیح دے کہ پہلا ایک نسل میں پیدا ہوا ہے اور دوسرا کسی اور نسل میں؟ پہلا سپید اور دوسرا سیاہ؟ پہلا ایک پہاڑ کے مغرب میں پیدا ہوا ہے اور دوسرا اس کے مشرق میں؟ پہلا ایک زبان بولتا ہے اور دوسرا کوئی اور زبان؟ پہلا ایک سلطنت کی رعایا ہے دوسرا کسی اور سلطنت کی؟ کیا جلد کے رنگ کو روح کی صفائی و کدورت میں کوئی دخل ہے؟ کیا عقل اس کو باور کرتی ہے کہ اخلاق و اوصاف انسانی کے صلاح و فساد سے پہاڑوں اور دریاؤں کا کوئی تعلق ہے؟ کیا کوئی صحیح الدماغ انسان تسلیم کر سکتا ہے کہ مشرق میں جو چیز حق ہو وہ مغرب میں باطل ہو جائے؟ کیا کسی قلب سلیم میں اس چیز کے تصور کی گنجائش نکل سکتی ہے کہ نیکی، شرافت، اور جوہر انسانیت کو رگوں کے خون، زبان کی بولی، مولد و مسکن کی قلمرو کے معیار پر جانچا جائے؟ یقیناً عقل ان سوالات کا جواب نفی میں دے گی۔ مگر نسلیت، وطنیت اور اس کے بہن بھائی نہایت بے باکی کے ساتھ کہتے ہیں کہ ہاں ایسا ہی ہے۔

قومیت کے عناصر پر ایک عقلی تنقید تھوڑی دیر کے لئے اس پہلو سے قطع نظر کیجئے۔ یہ جتنے اشتراکات آج قومیت کی بنیاد بنے ہوئے ہیں ان کو خود ان کی ذاتی حیثیت سے دیکھئے اور غور کیجئے کہ آیا یہ بجائے خود کوئی مضبوط عقلی بنیاد بھی رکھتے ہیں یا ان کی حقیقت محض ایک سراب تخیل ہے۔

نسلیت نسلیت کیا ہے؟ محض خون کا اشتراک۔ اس کا نقطۂ آغاز ماں اور باپ کا نطفہ ہے جس سے چند انسانوں میں خونی رشتہ پیدا ہوتا ہے۔ یہی نقطہ پھیل کر خاندان بنتا ہے، پھر قبیلہ، پھر نسل۔ اس آخری حد یعنے نسل تک پہنچتے پہنچتے انسان اپنے اس باپ سے جس کو اس نے اپنی نسل کا مورث اعلیٰ قرار دیا ہے، اتنا دور ہو جاتا ہے کہ اس کی مورثیت محض ایک خیالی چیز بن کر رہ جاتی ہے۔ نام نہاد تسلسل کے اس دریا میں بیرونی خون کے بہت سے ندی نالے آ آکر مل جاتے ہیں۔ اور کوئی صاحب عقل و علم انسان یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ یہ دریا خالص اسی پانی کا ہے جو اپنے اصلی سرچشمہ سے نکلا تھا۔ پھر اگر اس خلط ملط کے باوجود خون کے اشتراک کی بنا پر انسان ایک "نسل" کو اپنے لئے مادۂ اتحاد قرار دے سکتا ہے۔ تو کیوں نہ اس خون کے اشتراک کو بنائے وحدت قرار دیا جائے جو تمام انسانوں کو ان کے پہلے باپ اور پہلی ماں سے ملاتا ہے؟ اور کیوں نہ تمام انسانوں کو ایک ہی نسل اور ایک ہی اصل کی طرف منسوب کیا جائے؟ آج جن لوگوں کو مختلف نسلوں کا بانی و مورث قرار دے لیا گیا ہے ان سب کا نسب اوپر جا کر کہیں نہ کہیں ایک دوسرے سے مل جاتا ہے، اور آخر میں تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ وہ سب ایک اصل سے ہیں۔ پھر یہ آریت اور سامیت کی تقسیم کیسی ہے؟

وطنیت مرز و بوم کے اشتراک کی حقیقت اس سے بھی زیادہ موہوم ہے۔ انسان جس جگہ پیدا ہوتا ہے اس کا رقبہ یقیناً ایک گز مربع سے زیادہ نہیں ہوتا۔ اس رقبہ کو اگر وہ اپنا وطن قرار دے تو شاید دوسرے کو اپنا ہم وطن نہیں کہہ سکتا لیکن وہ اس چھوٹے سے رقبہ کے ارد گرد میلوں اور کوسوں تک، اور بسا اوقات سینکڑوں اور ہزاروں میل تک ایک سرحدی خط کھینچ دیتا ہے اور کہتا ہے کہ وہاں تک میرا وطن ہے اور اس سے باہر جو کچھ ہے اس سے میرا کوئی تعلق نہیں۔ یہ محض اس کی نظر کی تنگی ہے۔ ورنہ کوئی چیز اسے تمام روئے زمین کو اپنا وطن سمجھنے سے مانع نہیں ہے۔ جس دلیل کی بنا پر ایک مربع گز کا وطن پھیل کر ہزار ہا مربع گز بن سکتا ہے، اسی دلیل کی بنا پر وہ پھیل کر پورا کرۂ ارضی بھی بن سکتا ہے، اگر آدمی اپنے زاویہ نظر کو تنگ نہ کرے تو وہ دیکھ سکتا ہے کہ یہ دریا، پہاڑ، سمندر وغیرہ جن کو اس نے محض اپنے خیال میں حدود و فواصل قرار دے کر ایک زمین اور دوسری زمین میں فرق کیا ہے، سب کے سب ایک ہی زمین کے اجزا ہیں۔ پھر کس بنا پر اس نے ان دریاؤں اور پہاڑوں اور سمندروں کو یہ حق دے دیا کہ وہ اسے ایک خاص خطہ میں قید کر دیں؟ وہ کیوں نہیں کہتا کہ میں زمین کا باشندہ ہوں، سارا کرۂ ارضی میرا وطن ہے، جتنے انسان ربع مسکون میں آباد ہیں، میرے ہم وطن ہیں، اس پورے سیارے پر میں وہی پیدائشی حقوق رکھتا ہوں جو اس گز بھر زمین پر مجھے حاصل ہیں جہاں میں پیدا ہوا ہوں؟

لسانی امتیاز اشتراک زبان کا فائدہ صرف اس قدر ہے کہ جو لوگ ایک زبان بولتے ہیں وہ باہمی تفاہم اور تبادلۂ خیال کے زیادہ مواقع رکھتے ہیں۔ اس سے اجنبیت کا پردہ بڑی حد تک اٹھ جاتا ہے، اور وہ اپنے آپ کو ایک دوسرے سے قریب تر محسوس کرتے ہیں۔ مگر ادائے خیال کے وسیلہ کا مشترک ہونا خود خیال کے اشتراک کو مستلزم نہیں ہے۔ ایک ہی خیال دس مختلف زبانوں میں ادا ہو سکتا ہے اور ان سب کے بولنے والوں کا اس خیال میں متحد ہو جانا ممکن ہے۔ بخلاف اس کے دس مختلف خیالات ایک زبان میں ادا ہو سکتے ہیں اور کچھ بعید نہیں کہ اس زبان کے بولنے والے ان خیالات

(آزاد صحرائی)

اور وہ سوچنے لگا،

چار سال پہلے بھی تو والدہ صاحبہ اور مکان سے دیگر افراد چچا آپا کے ہمراہ بمبئی گئے ہوئے تھے اس وقت بھی وہ مکان میں تنہا تھا ـــ اور مکمل ایک ماہ اسنے تنہا بسر کیا تھا۔ تو پھر اب یہ اداسی، یہ بیجا غم، یہ نہ معلوم اضطراب اور اپنی تنہائی اور جوانی کا شعلہ فشاں احساس۔ آخر ایسا کیوں ہوا؟

جب وہ اسٹیشن سے باہر نکلا تو ایک اداسی چھائی تھی۔ اسٹیشن کے برابر پر کرڈر گیری اور سرینہ کی بلند عمارتیں کسی کسی کے طائر سینہ کے مانند نمایاں اور ابھری ہوئی معلوم ہو رہی تھیں سرڈر گیری کے ناکہ کی سپید سپید دیواریں گول مٹی سی گھڑی، پرانے وقتوں کے دیو کی آنکھ کی طرح ٹرین کو دیکھنے کی سعی لاحاصل کر رہی تھی۔ سرا کی دوسری منزل سے نکلے ہوئے چھجے پر چند مسافر ہنسی مذاق اور خوش فعلیوں میں مصروف تھے ـــ اسٹیشن روڈ بالکل سنسان تھی۔ اور اپنے دونوں بازوؤں میں ڈامبر کا حاشیہ لئے کسی حسین دوشیزہ کی جدید ساڑی کا بارڈر معلوم ہو رہی تھی۔ غرض تنہائی کے احساس نے رنگین سی رنگین اور دلچسپ سی دلچسپ چیزیں بے لطفی اور گرانی پیدا کر دیا تھا۔!

مکان میں داخل ہوا تو سب سے پہلے اسکی نظر سیوٹے کے درخت پر پڑی جس کی سب سے اونچی ڈالی پر ایک ننھا منا سا سیوٹا، اپنے مٹیالے رنگ میں اُسے گھور رہا تھا۔ گویا سوچ رہا تھا کہ آج یہ اس کی حالت کیا ہے ـ ؟ مکان میں اس قدر ویرانی و وحشت کیوں برس رہی ہے ـ ؟ مکان کے کل افراد کو میں نے کہاں چھوڑ دیا ہے ـ ؟ ؟

اُف ـ کتنا تضاد تھا اسکی نظروں میں ـ !

کل تک جس پھل کو اسکی نظریں تلاش نہ کر سکی تھیں آج باوجود اسکی بد دلی و پژمردگی کے اسکے سامنے تھا۔ مسرت بھی کیا چیز ہوتی ہے کہ انسان اپنوں سے تو دور رہا، خود اپنے وجود کی ہر ہر ادا کو بھول جاتا ہے۔

تو پھر بھلا وہ کب اس غریب شاخ پر لٹکے ہوئے پھل کو خاطر میں لاتا ـــ ؟

وہ اپنے کمرہ میں چلا آیا اور دھم سے صوفہ میں دھنس گیا۔ اسے اس وقت اسکی نرمی اور ملائمت کسی حسین و گداز لڑکی کی سیم پاش بانہوں سے بھی زیادہ لطیف، زیادہ راحت جان اور انتہا درجہ روح نواز محسوس ہو رہی تھی ـــ معاً ـــ اسکی نظریں اپنے ہاتھوں پر جا پڑیں۔ بائیں ہاتھ اور دائیں ہاتھ کی انگلیوں کے ناخن شفق کی مانند خون آلودہ تھے۔ وہ چند ثانیے انھیں ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا۔ اور خود بخود اسکی ویران آنکھوں سے گوشے بھیگ گئے۔ اور اسکے دماغ میں تصویر کے مانند رنگین پردوں پر شاما کے ہاتھوں کی انگلیاں ابھرنے لگیں اور ابھرتی گئیں۔

شاما ـ ! آہ، وہ اُسے کسقدر چاہتا تھا۔ کتنا پیار تھا اُسے شاما سے ـــ اسکی آواز کے سرگم میں تو وہ گھنٹوں اپنی ناداں ہستی کو گم کر دیتا تھا۔ اسکے لئے شاما بہت کچھ نہ ہوتے ہوئے بھی سب کچھ تھی۔ اسکی یہ شدت کیا تھی آرزو تھی کہ شاما کو ہر گھڑی اور ہر لمحہ دیکھتا رہے۔ اسکو اپنی اداس و پریشان آنکھوں کے گوشوں میں چھپا کے رکھ کر، کائنات کی رنگینیوں سے منہ پھیر لے ـــ اور وہ اُسکے ساتھ رہ کر اس کے دل کے کنول کو ہر وقت کھلا ہوا و شاداب رکھے ـــ لیکن، اگر انسان کی ہر خواہش پوری ہو جائے تو خدا کی ضرورت ہی محسوس نہ ہو ـــ یہ اداس آسمان کی سطح پر ہر لمحہ ڈوب کر ابھر ابھر آنیوالے جھلملاتے تارے، حسینوں کی آنکھوں پر جڑ دیئے جاتے۔ جیسے نگینہ انگشتری کی عظمت کو بلند و بالا کر دیتا ہے" اسی طرح یہ آب نیل میں تیرنے والے ننھے ننھے تارے حسینوں کی ہوش ربا آنکھوں میں زیادہ خوبصورت اور زیادہ دیدہ زیب بن جاتے۔ یہ صبح و شام نیلی گنبد کے بوڑھے رخساروں پر نمایاں ہونیوالی سرخی حسین چہروں پر اور کھل اٹھتی۔ یہ سفید سفید گال ـــ یہ پتلے پتلے نم آلود لب ـــ اور ان پر شفق کی کھلی ہوئی ہلکی ارغوانی سرخی ـــ ! تب حسن کسقدر دنیا ست خیز بن جاتا ـــ ! لیکن ایسا نہیں ہوتا اگر ہر آرزو پوری ہو جائے تو اُسے آرزو نہیں کہتے معمولی سی بات اور آرزو میں کچھ نہ کچھ تو فرق ہونا ہی چاہیئے ـــ

انسان حسن و جمال کے لئے بیتاب ہوتا ہے۔ نہ زر و زمین کے لئے۔ اور نہ ہی آرائش ملبوس زیبائش گیسو پر مرتا ہے ـــ بلکہ وہ تڑپتا ہے صرف اس لئے کہ فلاں چیز اسکی نہ ہوئی ـ !

اور ایسا ہی ہوا ـ زمانہ نے کھردرے ہاتھوں نے اسکے اور شاما کے درمیان ایک ناقابل عبور خلیج حائل کر دی ـــ اور اس نے بھی رقت اور ماحول کا ساتھ دیتے ہوئے ان تمام ملاقاتوں اور ان ہوش ربا فردوسی لمحوں کو بھلا دیا۔ کیونکہ اس کا خیال تھا کہ محبت ہی کے ذریعہ تو انسان دنیا میں زندہ نہیں رہ سکتا ـ ؟ محبت دنیا تو نہیں ہوتی ـــ ؟

اور بھی تو چیزیں ہوتی ہیں۔ اور بھی تو مناظر ہوتے ہیں۔ بیوہ کا ماتم ذکر کرتا ہوا ابھرا شباب ـــ سوسائٹی کے آئین۔ اور یہ آئے دن انت کے انداز سے نوخیز کلیوں کیطرح رسم کہن پر قربان ہونیوالی سرسبز و شاداب دوشیزائیں ـــ یہ امارت کے بربریت شباب فرسودہ خواب، اور یہ غربت کی کبھی نہ ختم ہونیوالی خونچکاں لاشیں ـ ؟ ؟

اور پھر اسکی نظریں اپنے ناخنوں پر رینگنے لگیں اور رینگتی گئیں۔ لال لال۔ سرخ سرخ، شفق جیسا ارغوانی رنگ ـ !

اور اسکی آنکھوں میں وہ رنگین دن پلٹ آیا ـ

ہولی کا دن تھا ـ شاما بھی اس تقریب میں مدعو تھی۔ نیلا، کامنی، ہیرا اور رادھا نے بھی نمایاں حصہ لیا تھا ـــ یوں تو ابتداً کھیل میں بڑا آدمی شرکت نہ کرتا تھا۔ لیکن جیسے جیسے وقت گزرتا جاتا، ہر کوئی اس کھیل میں نمایاں حصہ لیتا چلا جاتا ـــ

اچھائی اور برائی کی ہیرا وکیو اسکی نظریں تاڑ سکتی تھیں ہر اونچ نیچ کو وہ سمجھتا تھا۔ تعلیم نے اُسے بہت زیادہ حساس بنا دیا تھا۔ باپ کے ہمراہ رہکر وہ سوسائٹی کی عریانی، ذات پات کی قیود اور سماج کی سربلندی وپستی سے واقف ہو چکا تھا۔ مطالعہ اور مشاہدہ نے اُسے نیچے طبقہ کے لوگوں کی بود و باش کو روشناس کروا کر اسکی حس کو بہت زیادہ تیز اور لطیف بنا دیا تھا اور باپ کی ہمراہی نے اعلیٰ افراد کی گندہ ذہنیت کو اسکی نظروں میں بے نقاب کر دیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ یہاں مندر میں بت ہیں تو عوام لوگوں کو اندر جانے سے کیوں روکا جاتا ہے۔ وہ نے خبر تھی کہ ایک امیر آدمی ہی اللہ کے دروازے سے خوش خوش کیوں نکلتا ہے۔؟ اور اس سے بھی بیخبر نہ تھا کہ ایک غریب اور امیر کو دنیا کس نقطۂ نظر سے دیکھتی ہے۔؟

اور وہ یکایک سا چونک پڑا۔ ابھی۔ اس کے ہمجولی کے ساتھی کو چند لمحوں کے لئے اسکے دماغ سے جدا کر دیا گیا۔ نیلا نے رنگ سے بھرا ہوا جگ اسکے اوپر سے انڈیل دیا تھا۔ وہ ایک سرد کپکپی کیساتھ خیالات سے بیدار ہو گیا۔ اور ابھی سنبھلنے بھی نہ پایا تھا کہ ہیرا، کامنی اور رادھا نے اُسے تر بتر کر دیا۔ اور اس نے بھی رنگ سے بھری ہوئی پچکاری اُٹھا کر نہ صرف ہیرا اور کامنی پر ہی رنگ ڈالنا شروع کر دیا، بلکہ تمام لوگوں کو جو اس کھیل میں شریک تھے رنگ سے بھگو دیا۔ ہر ایک کی صورت دیکھنے کے قابل تھی۔ نیلا کی صورت تو پہچانی بھی نہ جا رہی تھی۔ البتہ ہیرا کے چہرہ پر زیادہ گہرا رنگ نہیں لگا تھا۔ ہلکا ہلکا۔ کچھ تو سرخ اور کچھ گلابی۔! اور ان دونوں کے امتزاج سے اسکے چہرے پر قوس قزح کے مانند رنگینی و جاذبیت ابھر آئی تھی ــــ ہر چہار جانب رنگ ہی رنگ تھا۔ در و دیوار، دالان و کمرے، نیچے اوپر، ادھر اُدھر ہر طرف رنگ کے بڑے بڑے دھبے پڑ گئے تھے نیلے نیلے۔ لال لال۔ اور سرخ سرخ دھبے...... بالکل جمے ہوئے خون کیطرح گہرے اور سیاہی مائل دھبے!

اور پھر وہ گزرے ہوئے واقعات کے عمیق گرداب میں چکر لگاتا ہوا ڈوبتا گیا۔ شادی ــــ شادی! یہ لفظ اس کے دماغ میں کالے ناگ کیطرح جھوم جھوم کر اور مست ہو ہو کر پھنکاریں مارنے لگا ــــ ماں باپ نے اس کے گلے میں بھی تو ایک زہریلے کالے ناگ کو ڈال رکھا تھا ــــ اور وہ ناگ عورت کے روپ میں لپٹا لپٹا یا شانتا کا پیکر تھا۔

شانتا کا خیال آتے ہی اُسے اپنی ازدواجی زندگی کا تاریک و کریہہ چہرہ آنکھوں میں پھرنے لگتا شانتا سے اُسے نفرت تھی۔ ایک بے معنی نفرت! جس کا اظہار ہر روز صبح جب وہ پوجا کے لئے تھال لیکر مسکراتی ہوئی آتی، تو وہ یوں محسوس کرتا گویا کوئی چڑیل اپنی خبیث صورت لئے اسکا تمسخر اڑا رہی ہے ــــ کہہ رہی ہے "کہاں ہے وہ تمہاری شانتا! جسے تم بیاہ کر لانے والے تھے ــــ کہاں ہے وہ تمہاری شانتا، جو کہا کرتی تھی تم ہی میری زندگی ہو تم ہی میری پہچان ہو کیلاش ..!" اور اسے اپنی بیوی کی صورت سے اسقدر نفرت ہوتی جاتی تھی جتنی کہ ایک سادہ لوح بچہ کو اپنے ٹوٹے ہوئے کھلونوں سے از خود ہو جاتی ہے ــــ اور زندگی اسکی نظروں میں پیچ و خم کھاتے پھنکاریں مارتے اور گرم گرم و تیز تیز سانسیں بھرتے ہوئے سانپوں سے اٹی پڑی تھی۔ ایک تو اس نے پہلے ہی مار دیا تھا۔ لیکن دوسرا اسقدر تیز و تند تھا جسکے نجات کیلئے اُسے سخت کشمکش کرنی پڑتی تھی ــــ اور اب جبکہ وہ فاتح تھا، نڈر اور بہادر ہو گیا تھا، اور درد سے واقف۔! زخم کھا کر صبر و ضبط کے دامن کو اس نے مضبوطی اور استقلال سے تھام لیا تھا۔ آہستہ اب معلوم ہو چکا تھا کہ زہریلے عناصر کو کس طرح موت کے گھاٹ اتارا جاسکتا ہے۔ وہ کیا ردعمل ہے جس سے عامل کے عمل کو توڑا جاتا ہے۔

اور وہ ایک حد تک باغی ہو چکا تھا۔ باغی ــــ رسم و ریت کا باغی۔ سوسائٹی کا باغی۔ دنیا کے برانے اصول کا باغی۔ بڑے بوڑھوں کے تھر تھر کانپتے ہوئے گندے و کند ذہن دماغوں کا باغی۔!!

اور اس لفظ کے خیال میں آتے ہی اسکے دل، دماغ، جسم اور روح تک میں ایک ہیجانی لہر برق کیطرح تڑپ جاتی ــــ

شانتا نے اپنی بیماری میں زیست سے ناامید ہو کر کہا تھا،

کیلاش اب آنسو بہانے سے کیا ہو گا ــــ؟ میں نے تمہیں اس لئے تو بلایا نہیں تھا۔ رونے کے لئے تو بہت زمانہ باقی ہے ــــ آنسو تو تمام عمر بہانا ہیں ــــ اس چنگاری کو جو میری دوست تک دل کے پردوں میں چھپی ہوئی ہے دنیا کے تمام آتشکدے بنا دو۔ ان آگ کے ذروں کو نفرت کے دامن سے ہوا دو۔ اور وہ دامن میں ہوں۔ میں ۔!

یہ عرصہ سے ان چنگاریوں پر برف کا موٹی تہہ کیطرح جما بیٹھا ہے۔ اب وقت آگیا ہے کہ تم اُسے اُٹھا دو ــ جلدی کرو کیلاش آؤ ــ آؤ کہ یہ وقت جس کا ایک ایک لمحہ عظیم الشان بادشاہوں اور شہنشاہوں کے پر شکوہ تاج و تخت میں آراستہ و مرصع ہونا چاہیے گنوانے کا نہیں۔

اُٹھو ــ دیکھو کہ رات کا یہ سکون افزا لمحہ جس میں تو میں تمہیں اور کبھی تم ہوں بیکار ضائع کر دینے کا نہیں۔!

اور پھر جب میں نہ رہوں گی، تو تمھیں وہ دامن ہی کہاں ملے گا جو چنگاریوں کی پرورش کرتا تھا ــ دنیا کے سارے آتشکدے تسخیر کر لو تو بھی تمہیں وہ چنگاری نہ ملے گی، جو شاید دامن کی ہوا سے شعلہ نار بن جاتی ہے ــ تمھارا خون شاید دہکتا اور لپکتا ہوا شعلہ نہ بن سکے گا ــــ تمہاری روح دنیا کے بے کیف و پھیکے رنگ و بو میں الجھ کر رہ جائیگی ــــ!

اقوام مشرق!

نظر آتے نہیں بے پردہ حقائق ان کو
آنکھ جنکی ہوئی محکومی و تقلید سے کور
زندہ کر سکتی ہے ایران و عرب کو کیونکر
یہ فرنگی مدنیت کہ جو ہے خود لب گور

اسلام انڈونیشیا میں

ملک حبیب الرحمٰن مسلم یونیورسٹی علیگڑھ

خاندانہ نظر سے دیکھا جائے تو تمام جزائر نارموسا - برٹش ملایا ڈچ ایسٹ انڈیز - فلپائن اور مڈاگاسکر مل کر انڈونیشیا کہلاتے ہیں لیکن سیاسی وجوہات کی بنا پر صرف ڈچ ایسٹ انڈیز ہی کو انڈونیشیا کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔

انڈونیشیا دنیا کے سامنے اپنے آپ کو مثال کو طور پر پیش کرتا ہے کہ وہاں صلح اور آشتی کو لیکر تبلیغ کے ذریعہ اسلام پھیلا۔ تلوار کی طاقت ہرگز استعمال نہیں کی گئی۔ اس طرح اس عالمگیر اسلامی پیغام نے وہاں کے لوگوں کے دلوں میں جگہ پیدا کر لی اور آہستہ آہستہ اسلام ترقی کرتا گیا یہاں تک کہ تمام آبادی تقریباً نوّے فیصدی جس کا ۱۹۴۰ء تک اوسط ۵ لاکھ تک ہے، اسلام سے ہم آغوش ہو گئی۔

زمانہ گذشتہ کی وسیع معلومات جو مشرقی تجارت سے وابستہ ہیں ان کے ذریعہ پتہ چلتا ہے کہ ۶۰۰ء سے قبل عرب ایشیا کے ملکوں کے ساحلی علاقوں میں تجارت کے ذریعہ آیا جایا کرتے تھے۔ اور اسی سلسلہ میں وہ سماترا جاوا وغیرہ جزیروں تک جا پہنچے بہت جلد انھوں نے وہاں کچھ اپنی آبادی پیدا کر لی سب سے پہلی جو تقریباً صحیح تاریخ ہے وہ ۱۱۰۰ء ہے جس میں اسلام انڈونیشیا میں پہنچا اور شمالی مغربی سماٹرا کے کچھ لوگوں جو ایکینز کہلاتے تھے ایک عرب جن کا نام عبداللہ عارف تھا انکے ہاتھ پر اسلام قبول کیا۔

عبداللہ عارف ہی کے ایک ساتھی برہان الدین کے ذریعہ دور مغربی ساحل تک اسلام پھیلتا چلا گیا۔ پندرھویں صدی کے شروع میں مینانگ کباؤ کے طاقتور بادشاہ نے اسلام قبول کر لیا جس سے اسلام کو کافی تقویت پہنچی سب سے پہلی مسلم حکومت اَچے میں ۱۲۰۵ء میں قائم ہوئی اور جوہان شاہ اس کا پہلا حکمراں تخت نشین ہوا

مارکوپولو اپنے مختصر قیام کا حال لکھتے ہوئے جو ۱۲۹۲ء میں سماترا کے شمالی ساحل پر کیا تھا بیان کرتا ہے جزیرے کے مشرقی کونے پر پرلاک کی سلطنت ہے تمام آبادی مسلم ہے ۱۳۴۵ء میں ایک چینی سیاح لکھتا ہے کہ ہم نے سماترا جاتے ہوئے تقریباً ... مسلم خاندانوں کی آبادی کو شمال میں پایا اور آرد سلطنت کا بادشاہ اور تمام کی تمام رعایا مسلمان ہے۔ پندرھویں صدی کے نصف میں اسلام بہت جلد ترقی کرنے لگا جنوبی سماترا اور خاص طور سے پلیمبانگ میں مضبوطی سے جڑ پکڑ لی اور پندرھویں صدی کے آخر میں پلیمبانگ کی آبادی بھی مسلمان ہو گئی یہ تبلیغی کام ... جگہ راڈین رحمت جاوا کی طرف سے اور جیناک کا ملالا بھی ایک سردار کے ذریعہ پلیمبانگ کی طرف سے جاری تھا بارھویں صدی کے آخر میں پاجاجارن جو مغربی جاوا میں واقع ہے، اس کے شہزادے نے اسلام قبول کر لیا وہ ایک سوداگر کی حیثیت سے ہندوستان گیا اور ایک بہترین مبلغ اسلام کی حیثیت سے واپس لوٹا ڈیڑھ صدی کے بعد ایک عرب مولانا ابراہیم نے مشرقی جاوا میں جہاں گریسیک واقع ہے تبلیغی کام شروع کر دیا اور گریسیک ہی اس زمانہ کا تبلیغی مرکز بن گیا جہاں سے مختلف مبلغ جماعت کی صورت میں اطراف میں روانہ کئے جاتے تھے اس طرح ہزاروں لاکھوں لوگ جوق در جوق اسلام کے حلقہ بگوش ہوتے گئے اور مسلم حکومتیں قائم ہوتی گئیں۔

اسی عرصہ میں دوسرے عرب مبلغوں نے سماتری اور جاوی سوداگروں میں نہایت ہی محنت کیساتھ تبلیغی جہاد جاری رکھا اور جزائر ملوکا کی آبادی اس سے متاثر ہوتی رہی۔ لیکن پندرھویں صدی میں اصل ترقی شروع ہوئی جبکہ (TIDOR) ٹائیڈر کا بادشاہ مع اپنی تمام رعایا کے مسلمان ہو گیا اور ٹرنیٹ (TERNATE) کے حکمراں نے گریسیک (GRESIK) جا کر ۱۴۹۵ء میں اسلام قبول کر لیا ان دونوں حکمرانوں نے دوسرے مبلغوں کی مدد سے اسلام کو چاروں طرف پھیلا دیا۔

بورنیو میں عام طور سے ساحلی علاقوں میں مسلمانوں کی تعداد روز بروز بڑھتی گئی۔ ۱۵۲۱ء میں اسپین والوں کے بیان کے مطابق ایک مسلم ریاست بورنیو کا شمالی علاقہ میں دیکھی گئی اور اسی زمانہ میں جنوبی علاقہ کی ایک ریاست بنجارمسین (BENJAR MASIN) کے بادشاہ اور اسکی رعایا نے اسلام قبول کیا ۱۶۰۵ء میں ریاست سکاندا (Sukadana) کا پہلا مسلمان حکمراں ہوا سولھویں صدی میں سلاویسی (Sulawesi) سیلیبس (Celebes) میں بوگیس (Bugis) اور میکاسرس (Macassars) نے مذہب اسلام اختیار کر لیا۔

سترھویں صدی کے شروع میں تقریباً سلاویسی کے تمام آبادی مع اپنے حکمراں کے دائرے اسلام میں بڑی سے بڑی تعداد میں داخل ہو گئی جس کو میکاسر کی ریاست ایک طاقتور حکومت بن گئی اس طرح انڈونیشیا کے دوسرے تمام جزائر مثلاً سمباوا (Sumbawa) فلورس (Flores) لمبوک روٹی وغیرہ کی تمام آبادی حقائق اسلامی سے متاثر ہو کر اسلامی سرچشمۂ حیات سے سیراب ہوتی رہی سولھویں صدی اور سترھویں صدی میں انڈونیشیا کے حکمرانوں کی جدوجہد یورپین اقوام کے بڑھتے ہوئے اقتدار انکی چیرہ دستیاں اسکے روک تھام کی کوشش نمایاں نظر آتی ہیں۔

تجارتی نقطۂ نظر سے انڈونیشیا ایک نمایاں خصوصیت کا ہمیشہ سے مالک رہا ہے اور اسکی خاص کشش کے باعث تمام دنیا کے بڑے بڑے تجارتی ملکوں کی نظر اس پر پڑتی رہی۔ مشرق اور مغرب دونوں کا تجارتی مرکز بن گیا۔ مغرب سے آنے والوں میں سب سے پہلے پرتگیز تھے۔

جب تک یہ مغربی ممالک والے سوداگروں کی حیثیت سے آتے رہے انڈونیشیا والوں نے ان کو خوش آمدید کہا لیکن جونہی انھوں نے دوسرے ملکی سیاسی مذہبی معاملات میں دخل اندازی کی تو وہ لوگ اس چیز کو ہرگز برداشت نہ کر سکے اور انھوں نے ان کے خلاف سخت کارروائی کی اور تمام انڈونیشیا کے حکمرانوں نے پرتگیزیوں کے خلاف جنگ کر کے ان کا قلع قمع کر دیا۔

دوسرے تمام یورپین سوداگروں کے ڈچ

سوداگر زیادہ اہم تھے۔ یہ لوگ ۱۵۹۶ء میں انڈونیشیا کے ساحل پر وارد ہوئے۔ لیکن جب انڈونیشیا والوں نے دیکھا کہ ڈچ بھی پرتگیز کیطرح ان کے ملک پر پوری پوری طرح قبضہ جمانا چاہتے ہیں تو انکے خلاف بھی اعلان جنگ کر دیا۔ اور سب نے ملکر انکو نکال دینے کی ہر ممکن کوشش کی۔ لیکن بدقسمتی سے اٹھارویں صدی میں انڈونیشیا کے حکمران اپنے کو متحد نہ رکھ سکے اور روز بروز انکی طاقت گھٹتی گئی اور ڈچ برابر اپنے اقتدار کو مضبوط تر بناتے گئے۔

اس زمانے کے نمایاں محب وطن اور مجاہدوں میں جنھوں نے ڈچ فوجوں کو شکست دینے کے لئے جان کی بازی لگادی بنٹان (Bantam) ریاست کے سلطان عبدالفتح اگونگ (۱۶۵۱ء سے ۱۶۸۳ء تک) مدورا کا شہزادہ ترونا جوجو اور ملینیر کے ایک گوریلا لیڈر سوراپتی

انیسویں صدی میں رفتہ رفتہ انڈونیشیا کی تمام ریاستیں موت اور زندگی کی کشمکش میں مشغول رہتے رہتے ناپید ہوگئیں اور اس طرح ڈچ خونخوار بھیڑیوں نے انکی آزادی کی روح کا گلا گھونٹ دیا۔

لیکن پھر کچھ دن بعد انڈونیشیا کے محب وطن نوجوانوں کے دلوں میں حریت اور آزادی کا شعلہ بھڑکنے لگا اور مستقل قومی تحریک ترقی کرتی گئی۔ سب سے پہلا لیڈر جس نے آزادی وطن کے لئے جدوجہد کی متّرام (Mataram) کے سلطان امنگ کیونا کا سب سے بڑا لڑکا عبدالحمید ڈیپونیگرو تھا جس نے ڈچ حکومت کے ساتھ فیصلہ کن جنگ کی تیاری کی اور ۱۸۲۵ء سے ۱۸۳۰ء تک مسلسل ۵ سال تک مع اپنے ساتھیوں کے ڈچ فوجوں سے جنگ آزما رہا۔ اور انکو زبردست جانی و مالی نقصان پہنچانے میں کامیاب رہا۔

تقریباً اس کے ساتھ ہی ایک محب وطن دلیر بندہ ٹونکی امام بنجال کی سرکردگی میں سماترا میں ایک زبردست انقلابی بغاوت کا آغاز ہوگیا۔ ۱۸۳۷ء میں ڈیپونیگرو کے پکڑ جانے کے بعد ٹونکی ہی کو تمام ڈچ طاقت کا مقابلہ کرنا پڑا آخر میں مجبوراً انکو شکست کھانی پڑی اور دونوں کو سلاویسی کے جزیرے میں جلاوطن کردیا گیا۔

انیسویں صدی کے انڈونیشیا کا آخری قومی ہیرو آچے کا ٹینکو عمر تھا۔ صرف یہی ریاست تھی جس کے دفاع کو ڈچ شکست نہ کر سکے تھے ۱۸۷۳ء میں ڈچ اور سلطان اتجیہ کے مابین لڑائی چھڑ گئی ۱۹۰۸ء میں ڈچ سلطان کے ملک کے کافی حصہ پر قابض ہوگئے لیکن باقی دوسرے لوگ برابر اپنے ملک وطن کی آزادی اور عزت کی خاطر ان غیر ملکی خونخوار بھیڑیوں سے دلیرانہ جہاد کرتے رہے۔ اور اس غیر فانی حریت پسند جذبہ کو ڈچ طاقت فنا نہ کر سکی۔ ان کی تمام فوجی چالیں ایک ایک کرکے ختم ہوگئیں لہذا انھوں نے صلح کا معاہدہ کرنا چاہا جو محض ایک چالبازی پر مبنی تھا جیسا کہ دوسری یوروپین قومیں ایشیائی ملکوں سے کرتی چلی آئی ہیں۔

۲۹ مارچ ۱۸۹۶ء میں ٹینکو عمر نے پھر ایک نئی کروٹ لی اور ڈچ فوجوں کی رات کی نیند اور دن کا آرام حرام کردیا اور اس طرح یہ مجاہد اعظم ۱۱ فروری ۱۸۹۹ء میں دشمنوں کے خلاف جنگ کرتا ہوا ملک و وطن پر قربان ہوگیا۔

۱۹۰۸ء تک اس قسم کی تمام لڑائیاں ختم ہوگئیں لیکن چھوٹی چھوٹی لڑائیاں اور جھڑپیں ۱۹۱۳ء تک برابر جاری رہیں آچے (Acheh) اور سلاویسی پر ڈچ صحیح معنوں میں کبھی قبضہ نہ جما سکے۔

قبل اس کے کہ ڈچ تمام انڈونیشیا کے پورے پورے مالک بن جائیں انڈونیشیا کے مسلمانوں نے پھر حاجی عمر سعید جوکرو امینوٹو اور حاجی اگس سلیم کی سرکردگی میں ایک نئی قومی تحریک کے ذریعہ اپنے کو منظم کرنا شروع کردیا اس تحریک کا نام "سرکار اسلام" تھا جو بعد کو "ایس۔ آئی" کے نام سے کہلائی جانے لگی۔ جب ایس آئی کی جگہ محمدیہ نے لی تو یہ حاجی ڈحلن کی قائدگی میں انڈونیشیا کی سب سے بڑی قومی مذہبی جماعت سمجھی جانے لگی۔ پریسیڈنٹ سوئیکارنو ایک مرتبہ سماترا کے شہر بنکولن میں اس جماعت کے صوبائی مشیر تھے۔

ایس۔ آئی بعد کو ۱۹۲۳ء میں ایک نئی جماعت بن گئی جس کا نام "پارٹی شرکت اسلام انڈونیشیا" ہوگیا۔ انڈونیشیا کے مسلمان چھوٹی چھوٹی جماعتوں میں بھی منظم ہونا بھی شروع ہوگئے۔ لیکن آخر میں پی ایس آئی۔ آئی تمام مسلم جماعتوں کو ایک فیڈریشن (Majelis A'la) کے ماتحت لے آئی۔ ۱۹۳۹ء میں تمام انڈونیشیا کی سیاسی فیڈریشن بلائی گئی اس کا نام جی اے پی۔ آئی تھا اس میں ایم۔ آئی۔ اے۔ آئی جماعت نے بھی شرکت کی اور ایک زبردست عوامی مانگ ڈچ گورنمنٹ کے سامنے پیش کی

جاپانیوں کے قبضہ کے دوران میں انڈونیشیا کے مسلمان جاپانی شہنشاہیت کیخلاف اسی طرح لڑتے رہے جیسا کہ وہ ڈچوں کے خلاف لڑ چکے تھے اور اس وقت موجودہ جمہوری حکومت کا سب سے بڑی جماعت تمامتر مسلمانوں پر مشتمل ہے۔

انڈونیشیا کے مسلمان ہمیشہ دنیا کے دوسرے مسلمانوں کیساتھ انکی تمام تحریکوں میں اشتراک عمل کرتے رہے۔ سلطان عبدالفتح اگوانگ نے اپنے لڑکے کو حج کا فریضہ ادا کرنے کے لئے مکہ بھیجا اور وہاں سے ترکی حکومت کو روانہ کیا تاکہ دوسرے تمام اسلامی ملکوں سے ایک تعلق اور سردارانہ وابستگی قائم رہ سکے جبکہ شمالی افریقہ کے بربری عربوں پر زیادتی اور ظلم کیا گیا تو انڈونیشیا کے مسلمانوں نے سخت احتجاج کیا اور ساتھ ہی جبکہ اٹلی نے ترپولی اور برقہ میں مسلمانوں کا خون بہایا تو انھوں نے اٹلی کے تمام مال کا بائیکاٹ کردیا اٹلی کی بنی ہوئی ٹوپیاں جلاکر خاک کردیں فیاٹ کاریں دریاؤں میں پھینک دیں اور کچھ انڈونیشیا کے مسلمان فلسطین بھی پہنچے اور ظلم انسداد کے خلاف جہاد کرکے دنیا پر پھر سے یہ ثابت کردیا کہ مسلمان خواہ کہیں بھی رہے وہ ایک دوسرے کے دکھ درد اور آرام اور خوشی میں برابر کا شریک ہے ساری دنیا کے مسلمان ملکر ایک قوم کہلاتے ہیں جہاں تک کہ انڈونیشیا کے مسلمانوں کا تعلق ہندوستان کے مسلمانوں سے ہے انڈونیشیا کے مسلمان اس چیز کے احسان مند ہیں کہ ہندوستان ہی سے تبلیغی وفد انڈونیشیا پہنچے۔ اور انکو اسلام کی صحیح اور سچی روشنی دکھائی۔ زیادہ تر وفد جنوبی ہند سے روانہ ہوئے یہی وجہ ہے کہ موجودہ انڈونیشیا کی مسلمان آبادی کی مسلم دینیات اور رسم و رواج پر ان کا نمایاں اثر ہے۔ زیادہ تر شافعی فرقہ کے مسلمان ہیں جوکہ ہندوستان میں کورومنڈل اور ساحل مالابار پر آباد ہیں ۱۳۶۰ء میں جبکہ ابن بطوطہ یہاں پہنچا اسکا بھی یہی بیان تھا۔ آگے چلکر وہ لکھتا ہے کہ سماترا میں سموڈرا (Samudra) کے مسلمان مغلوں کے ہندوستان میں دہلی کے دربار سے اچھے دوستانہ تعلقات تھے لیکن بہت عرصے پہلے دکن کے سوداگر انڈونیشیا کے ساحلی علاقوں میں آباد ہوچکے تھے اور اسلامی پودے کو سینچ رہے تھے۔

ہندوستان اور انڈونیشیا کے مسلمانوں کا بلاواسطہ رشتہ برابر مغل بادشاہوں کے زمانے سے چلا آرہا ہے
(باقی صفحہ ۱۶ پر)

انیس جہاں

آج کی شام غیر معمولی طور پر خوبصورت اور دلکش تھی۔ بہار کا آغاز ہو چکا تھا۔ اسلئے موسم بھی خوشگوار تھا۔ میں بڑی دیر تک کھڑکی کے سامنے بیٹھی ہوئی تازہ اخبار پڑھتی رہی۔ اور جب اخبار بھی ختم ہو گیا تو پھر کچھ لکھنے لگی۔ کاغذ کے دو تین صفحے یونہی فضول باتوں سے سیاہ کر دیئے۔ آخرش اکتا کر باہر نکل گئی۔ بارش کی وجہ سے سڑک پر جا بجا گڑھوں میں پانی بھر گیا تھا۔ سڑک کچھ چکنی سی ہو گئی تھی۔ بار بار پیر پھسلنے لگتا۔ بارش میں تو عموماً پیر پھسلتے ہی ہیں۔ ادھر کوئی پھسلا اور ادھر لوگ قہقہہ مار کر ہنسے۔ گرنے والا اس طرح شرمندہ ہو کر بھاگتا ہے جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔ اور اگر بارش نہ بھی ہو تو نہ سہی۔ پھسلنے والے تو پھسل ہی جاتے ہیں۔ اور اس طرح یہ پھسلن بھی کئی طرح کی ہو کر رہ جاتی ہے۔ ایک پھسلن تو یہ بھی ہوتی ہے کہ بارش کی وجہ سے پیر پھسل جاتا ہے۔ اور ایک پھسلن وہ ہوتی ہے جو کسی سیمیں بدن والی دلنشیں کو دیکھنے سے ظہور میں آ جاتی ہے۔ تلون کیش نیتیں پھسل جاتی ہیں رائل بازار کی دلکش دوکانوں کے سامنے موٹریں کھڑی تھیں۔ کچھ تانگے بھی آمد و رفت کا سلسلہ جاری تھا۔

لوگ دفاتر سے واپس ہو رہے تھے۔ بوڑھے اور جوان آنکھیں دوکانوں کے اندر آنے جانے والی عورتوں کے برقعوں میں زبردستی گھسنے کی کوشش کر رہی تھیں کچھ لوگ یونہی ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے لئے کھڑے ہو گئے۔ کم از کم تانگہ پر سوار ہونے والیوں کے خوبصورت سینڈل ہی نظر آ جائیں۔ اور سینڈلوں کے اندر سے نظر آنے والے سفید سفید اور حنائی حنائی پیروں کی جھلک۔ کیا کچھ کم تھی؟ نمائش ہو رہی تھی تانگے بابعالی کی جانب سرپٹ بھاگے جا رہے تھے۔ پیروں کے اندر سے سینٹ کی بھینی بھینی خوشبو نکل کر دماغوں کو معطر کرنے لگی نمائش کے موضوع پر مختلف قسم کی ہونے والی باتیں۔ انگریزی ملی ہوئی اردو اور پھر آواز کا ترنم۔ تانگے والے بھی پیسے پیسنے لگے۔

وہ بولا بالم کیا جانے . . . .

کچھ پتہ نہیں کہاں کہاں کی سڑکیں ناپیں۔ لوٹنے کا ارادہ کر ہی رہی تھی کہ نمائش سے واپس آتی ہوئی مس گپتا مل گئی۔

کہاں گھومتی پھر رہی ہو اس نے پوچھا۔

سر بازار پھرنا۔ ہنسنا۔ مسکرانا گویا آوارہ گردوں کو اپنی طرف متوجہ کرنا۔ یہ اچھا نہیں۔ کم از کم میں اسے پسند نہیں کرتی۔

ہاں یہ تو میں بھی مانتی ہوں میں نے آتی ہوئی ہنسی کو ضبط کرتے ہوئے کہا۔ میں کیا کروں گپتا ہنسی آج رکتی ہی نہیں۔ آج میں نے ایک افسانہ لکھا ہے۔

غارت ہو جائے تمہارا افسانہ اور تم کو کیا کہوں پھر وہ بات کا رخ بدلتے ہوئے بولی۔ اچھا یہ بتاؤ نمائش بھی دیکھی۔

ہاں کیوں نہیں۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ میں نے اور بھی بہت کچھ دیکھا ہے۔ دوکانوں کے اندر آنے جانے والی عورتیں۔ دفتر سے آتے ہوئے مرد گھورتی ہوئی تیز تیز نادیدہ سی آنکھیں۔ پھسلتے ہوئے جوان اور بوڑھے اور گپتا میں نے ان لوگوں کو بھی دیکھا ہے۔ جو تاج کی کی چھت پر چڑھ کے باب عالی کی سنہری روپہلی عورتوں کو دیکھ رہے تھے۔ اور بابعالی کے اس دربان سپاہی کو بھی دیکھا ہے۔ اسکی باتیں بھی سنی ہیں جو نمائش سے واپس جانے والی عورتوں کو کہہ رہا تھا۔

اجی آپ تو ابھی سے جا رہی ہیں کھانا تو کھایا ہوتا کم از کم پانی ہی پی لیجئے۔

مسیحا ہو کے بیماروں کو کس پر چھوڑے جاتے ہو. . . .

تم کیسی باتیں کر رہی ہو گپتا کہنے لگی۔

معلوم ہوتا ہے آج تم نے کچھ پی لی ہے۔

نہیں۔ یہ میرے مذہب میں جائز نہیں۔ ہاں یہ ممکن ہے خود تم نے ہی کچھ پی لیا ہو۔ اچھا خیر جانے دو اسے وہ کہنے لگی میں تم سے ایک ضروری بات کہنا چاہتی ہوں اچھا ہوا تم مل گئیں۔ بات یہ ہے کہ نمائش کی وجہ سے کل اسکول میں چھٹی تھی۔ میں ایک دوکان پر کچھ خریدنے گئی۔ دوکان پر ایک صاحب کتابیں خرید رہے تھے اور وضع قطع سے طالب علم معلوم ہوتے تھے۔ میری مطلوبہ چیزیں دیکر دوکاندار کہنے لگا۔ آپ اتنی دیر ٹھہر جایئے کہ یہ صاحب سامان خرید لیں۔ اس کے بعد آپ کے نوٹ کے باقی روپے دیدیئے جائیں گے۔

لیکن جناب مجھے دیر ہو رہی ہے میں اتنی دیر نہیں ٹھہر سکتی۔ میں نے اعتراض کیا ابھی دوکاندار جواب بھی نہ دینے پایا تھا کہ وہی صاحب جو پہلے سے موجود تھے کہنے لگے۔ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ مجھ سے لے لیجئے۔ جتنے روپے کی ضرورت ہے آپکو۔

میں نے کہا گپتا یہ لوگ ہمیشہ عورتوں کی پریشانی سے متاثر ہو کر اپنی خدمات پیش کر دیتے ہیں۔ اور اگر کبھی کوئی انکا ہم جنس کسی پریشانی میں مبتلا ہو جاتا ہے تو اس طرح کترا کر نکل جاتے ہیں۔ جیسے ان خادمان قوم نے دیکھا ہی نہیں مس گپتا ہنسنے لگی۔

ہاں تو خیر میں کل شام سینما چلی گئی۔ برابر والی سیٹ پر کوئی صاحب رونق افروز تھے۔ انٹرول ہونے پر میں نے دیکھا کہ یہ وہی صاحب تھے جنھوں نے ازراہ ہمدردی جی ہاں محض ازراہ ہمدردی میرے نوٹ کی عوض روپے عنایت کئے تھے۔ انھوں نے بہت کوشش کی کہ کسی طرح میں ان سے ہمکلام ہوں۔ یا ان کو ہی گفتگو کرنے کا کوئی بہانہ ہاتھ لگ جائے۔ ادھر میں نے انکی طرف توجہ کی اور ادھر کھیل ختم۔ اور وہ آغاز گفتگو کا بہانہ تلاش نہ کر سکے۔ لیکن جس وقت میں سینما کی عمارت سے باہر نکل رہی تھی۔ میرے کرمفرما نے دانستہ اپنا ایڈریس کارڈ میرے پیروں پر گرا دیا۔ میں نے کارڈ اٹھا لیا۔

کیا نام ہے ان کا۔ میں نے پوچھا۔

برش چندر۔ لاہور میں ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ اب میں اپنی غلطی پر بیحد متاسف ہوں کہ میں نے کارڈ کیوں اٹھا لیا۔ اور اگر اٹھا یا بھی تھا تو کیوں نہ اسکی آنکھوں کے سامنے ہی پرزہ پرزہ کر دیا۔

ہاں واقعی تم نے غلطی کی کارڈ اٹھا لینے سے اسکی ہمت افزائی ہو گئی۔ کیا تعجب پھر وہ تمہیں پریشان کرے گپتا کہنے لگی آج سویرے جب میں ہسپتال جا رہی تھی وہ مجھے راستہ میں ملگیا اور پھر واپسی میں بھی بائیکل لئے ہوئے

(باقی صفحہ ۱۶ پر)

ہندوستان اور جنوبی افریقہ کے تعلقات!

ایشیاٹک لینڈ ٹینور بل کے نتائج!!

ایشیاٹک لینڈ ٹینور اینڈ انڈین ری پریزنٹیشن بل کو ملتوی کرنے کے بارے میں جنوبی افریقہ کی یونین گورنمنٹ نے حکومت ہند کے احتجاج سے متواتر بے اعتنائی برتی ہے۔ یونین گورنمنٹ کے اس رویہ کے خلاف احتجاج کے طور پر ہندوستان اور جنوبی افریقہ کے درمیان موجودہ تجارتی معاہدہ ختم کیا جا رہا ہے۔ اور چونکہ حالات سدھرتے نظر نہیں آتے اس لئے ضروری خیال کیا گیا ہے کہ ہائی کمشنر کو واپس بلا لیا جائے۔

یونین گورنمنٹ نے ابھی ابھی جو ڈرافٹ ایشیاٹک لینڈ ٹینور اینڈ انڈین ری پریزنٹیشن بل پاس کیا ہے اور جس کی گورنر جنرل سے منظوری مل چکی ہے وہ ان قوانین کے سلسلے کی ایک انتہائی کڑی ہے جنہیں یونین گورنمنٹ جنوبی افریقہ میں مقیم ہندوستانیوں کی مخالفت اور حکومت ہند کے احتجاج کے باوجود وقتاً فوقتاً پاس کرتی رہی ہے۔ اس وقت جنوبی افریقہ میں ہندوستانیوں کی آبادی ۲۴۰۰۰۰ ہے۔ اور یہ نٹال۔ ٹرانسوال اور کیپ آف گڈ ہوپ میں پھیلی ہوئی ہے۔ نٹال کے صوبہ کے ۲۰۰۰۰۰ ہندوستانیوں میں سے جو وہاں بود و باش اختیار کر چکے ہیں۔ ۱۱۸۰۰۰ افراد ڈربن میں رہتے ہیں ڈربن میں یورپینوں کی آبادی ۱۲۵۰۰۰ ہے۔

ہندوستانیوں نے ۱۸۶۰ء میں نٹال جانا شروع کیا۔ ان کا وہاں جانا حکومت نٹال کی متواتر درخواستوں کی وجہ سے تھا جو اس نے گنے کے مزرعوں کے لئے غیر ہنرمند مزدوروں کے حصول کے لئے کی تھیں۔ جب مزدوروں کے متعلق پہلے اقرارنامہ کی میعاد ختم ہو گئی اور انہوں نے ہندوستان واپس آنا شروع کیا تو آبادکاروں کو مقامی طور پر دیسی مزدور حاصل کرنے میں دقت پیش آئی، اور شکر کی صنعت کو تباہی کا خطرہ لاحق ہو گیا۔ حکومت نٹال نے پھر درخواستیں کرنا شروع کیں چنانچہ حکومت نٹال اور حکومت ہند کے درمیان ایک معاہدہ ہوا جس کی رو سے ہندوستان سے گئے ہوئے ان مزدوروں کو جو مزدوری کی مقررہ میعاد کو پورا کرنے کے بعد ان نوآبادیوں میں بود و باش اختیار کرنا چاہتے تھے ہندوستان جانے کے لئے مفت سفر کے انتظام کے عوض زمینیں دی جاتی تھیں اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۸۷۴ء میں لوگ پھر نٹال جانے لگے۔ ترک وطن کر کے نٹال جانے کی شرائط کا ایک اہم جزو یہ تھا کہ مزدوری کے اقرارنامہ کی میعاد ختم کرنے کے بعد مزدوروں کو وہاں وہی درجہ حاصل ہوگا جو دوسرے لوگوں کو حاصل ہے۔ وہ ملک کے عام قانون کے تحت زندگی بسر کرے گا۔ اور کسی قسم کے امتیازی قوانین کا شکار نہیں بنایا جائے گا حقیقت یہ ہے کہ حکومت ہند نے اپنے مراسلے میں حکومت نٹال پر یہ بات واضح کر دی تھی کہ "ہم لوگوں کے دوبارہ نٹال جانے کی اسوقت تک اجازت نہیں دے سکتے جب تک ہمیں یہ اطمینان نہ ہو جائے کہ نوآبادی کے حکام کو ہندوستانی تارکان وطن کے متعلق اپنے فرائض کا پورا پورا احساس ہے اور یہ کہ نٹال میں ملک معظم کی تمام رعایا کی پوری پوری حفاظت کو یقینی بنانے کے لئے موثر تدابیر اختیار کی گئی ہیں" ۱۸۷۴ء کے بعد مزدوری کے اقرارنامہ کے مطابق ہندوستانیوں نے متواتر نٹال جانا شروع کیا۔ اور قدرتی طور پر جلد ہی آزاد ہندوستانی بھی وہاں جانے لگے کیونکہ اس وقت ان کے جنوبی افریقہ میں بود و باش اختیار کرنے میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔

پابندیاں!

حکومت ہند نے ہندوستانی مزدوروں کو جنوبی افریقہ جانے کی ترغیب دینے کے لئے اس غرض سے بہت کچھ کیا کہ حکومت نٹال اور باغات کے مالکوں پر احسان کیا جائے۔ لیکن جب وہ وقت آیا کہ اس نوآبادی میں ہندوستانی آزاد لوگوں کی حیثیت سے آباد ہو سکیں تو حکومت نٹال نے اپنے معاہدے کا پاس کرنے کی بجائے ان پر پابندیاں لگانا شروع کر دیں۔ ۱۸۹۶ء میں ہندوستانیوں کو سیاسی رائے دہی سے محروم کر دیا گیا۔ اس کے بعد ۳ پونڈ سالانہ کی شرح سے پول ٹیکس لگا دیا گیا۔ اور ۱۹۱۳ء میں ہندوستانیوں کو ممنوعہ تارکان وطن قرار دے دیا گیا۔ ساتھ ہی ساتھ ہندوستانیوں کے داخلہ ان کی رہائش اور تجارت پر پابندیوں کی شکل میں ٹرانسوال میں ہندوستانیوں کے خلاف شورش جاری رہی۔

ہندوستانیوں کے خلاف شورش کا نتیجہ مسٹر گاندھی کے زیر ہدایت عدم تشدد کی مدافعانہ تحریک کی صورت میں ظاہر ہوا۔ جنرل سمٹس اور گاندھی کے درمیان ۱۹۱۴ء میں ایک معاہدہ ہو جانے پر بند کر دی گئی۔ اس معاہدہ کی رو سے ۳ پونڈ والے ٹیکس کی منسوخی اور دوسری شکایتوں کے ازالہ کا وعدہ کیا گیا۔ جنرل سمٹس نے یہ امید ظاہر کی اس معاہدہ سے اس جھگڑے کا آخری اور قطعی فیصلہ ہو جائیگا پہلی جنگ عظیم کے بعد ہندوستانیوں کے خلاف ایک تازہ شورش شروع کی گئی۔ جس نے ایسے قوانین کی شکل اختیار کر لی جس کا مقصد یہ تھا کہ شہری علاقوں میں زمین خریدنے اور رہائش کرنے پر پابندیاں لگا دی جائیں۔ ڈاکٹر ملان کے الفاظ کا مدعا یہ تھا کہ ہندوستانیوں کو ایک غیر عنصر سمجھا جائے اور ان کی تعداد کو کافی حد تک گھٹا دیا جائے — خوش قسمتی سے پارلیمنٹ کے ٹوٹ جانے کی وجہ سے کلاس ایریاز بل زائد المیعاد ہو گیا۔ اگلے سال ایریاز ریزرویشن بل پارلیمنٹ میں پیش کیا گیا۔ جسے حکومت ہند اور حکومت نٹال کے درمیان ۱۹۲۶ء میں ایک کانفرنس میں مشترکہ مذاکرات تک حکومت ہند کے کہنے پر واپس لے لیا گیا۔ اس معاہدہ کی رو سے جسے کیپ ٹاؤن اگریمنٹ کہا جاتا ہے، یونین گورنمنٹ نے یہ ذمہ داری قبول کی کہ وہ تعلیم اور دوسرے ذرائع سے

ان ہندوستانیوں کی ترقی کا انتظام کرے گی۔ جو یونین میں رہ جائیں اور جو مغربی طرز زندگی اختیار کرنے کے لئے تیار ہوں۔ دوسری طرف حکومت نے بھی وطن واپس آنے والے ہندوستانیوں کے لئے اور زیادہ انتظامات کرنے کی انتہائی کوشش کا وعدہ کیا۔

لیکن کیپ ٹاؤن اگریمنٹ پر کبھی عمل نہیں کیا گیا۔ صوبائی اور میونسپل حکومتوں کی غفلت کی باعث اس معاہدہ کی بہبودی و ترقی والی دفعات پر عملدر آمد کبھی نہیں کیا گیا۔ آج بیس سال کے بعد حالت یہ ہے کہ جنوبی افریقہ کے ہندوستانیوں کو رائے دینے کا کوئی حق حاصل نہیں اور ان مختلف قسم کی اقتصادی، سماجی اور سیاسی پابندیاں عاید ہیں۔ جنوبی افریقہ کی یونین میں بسنے والے ہندوستانی ایک صوبے سے دوسرے صوبے کو نقل مکانی نہیں کر سکتے۔ وہ ٹرامین۔ ریل کے ڈبے۔ تفریح گاہیں اور ایسے ریستوران استعمال نہیں کر سکتے جو صرف یوروپینوں کے لئے مخصوص ہوں۔ ان کیلئے طب یا انجینیری کی تربیت حاصل کرنے کی کوئی سہولیتیں موجود نہیں۔ لازماً حکومت ہند کو جنوبی افریقہ سے آنے والے ہندوستانی طالب علموں کیلئے ہندوستان کی مختلف درسگاہوں میں نشستیں محفوظ کرنی پڑتی ہیں۔ اونچے جگہوں کے علاوہ ہندوستانی کسی آسامی پر متعین نہیں۔

سنہ ۱۹۳۹ء کا عارضی قانون!

جہاں تک ٹرانسوال کے ہندوستانیوں کا تعلق ہے یونین گورنمنٹ نے ۱۹۳۱ء کا عارضی قانون منظور کر کے ۱۹۳۹ء میں ہندوستانیوں کے ان حقوق پر پابندی لگائی جا ہی کہ وہ بعض زمینیں نہیں لے سکتے اور ٹرانسوال میں کہیں بھی تجارت نہیں کر سکتے (آجکل ٹرانسوال کے ہندوستانی تاجروں کو لائیسنس لینا پڑتا ہے جو آسانی سے نہیں ملتا) اور وہ اس شہر میں اپنا کاروبار کسی دوسری جگہ منتقل نہیں کر سکتے۔ یہ قانون دو سال کے لئے تھا۔ اس کے بعد ۱۹۴۰ء میں انڈین پینی ٹریشن کمیشن مقرر کیا گیا جسے پہلا بروم کمیشن کہا جاتا ہے اس کمیشن کا کام یہ تھا کہ اس امر کی تحقیقات کر کے ایک رپورٹ پیش کرے کہ آیا یہ حقیقت ہے کہ ہندوستانی

ان زمینوں پر ناجائز قبضہ کر رہے ہیں جو ان علاقوں میں واقع ہیں، جہاں یوروپینوں کی غالب اکثریت ہے۔ کمیشن نے رپورٹ پیش کی کہ ۱۹۲۷ء سے ٹرانسوال میں ہندوستانیوں کا داخلہ خطرناک یا حیرتناک حد تک نہیں ہوا۔ اور نٹال میں بھی ان کا داخلہ بالکل معمولی رہا۔ اس کے کچھ عرصہ بعد یوروپینوں نے بیان کیا کہ کمیشن کی رپورٹ کی اشاعت کے بعد یوروپینوں کی غالب اکثریت والے علاقوں میں ہندوستانیوں کا داخلہ ایک شدید خطرہ بن گیا ہے۔ اور انہوں نے ڈربن کے لئے ایک اور کمیشن کے تقرر کے لئے شور مچایا۔

دوسرا بروم کمیشن!

چنانچہ ایک کمیشن مقرر کیا گیا جو عام طور پر دوسرا بروم کمیشن کہلاتا ہے۔ اور اس نے رپورٹ پیش کی کہ اگرچہ ہندوستانیوں نے تھوڑا نفوذ کیا ہے مگر اسے بہت زیادہ مبالغہ کیا تھا بیان کیا گیا ہے اور کمیشن اور پبلک کو ایک غلط نقشہ پیش کر کے اور واقعات کو توڑ مروڑ کر گمراہ کیا گیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ہندوستانی تاجروں نے جنگ کے دوران میں روپیہ کمایا تھا۔ اور وہ کسی کام میں نہیں لگایا گیا تھا۔ وہ اپنا روپیہ ہندوستان اس خوف سے نہ بھیج سکے کہ کہیں ان پر بیرونی ملک سے محبت رکھنے اور اس ملک سے ناجائز فائدہ اٹھانے کا الزام نہ لگایا جائے، جس میں وہ سکونت اختیار کر چکے تھے۔

اس کے علاوہ وہ تقریباً گندی جگہوں میں رہتے تھے۔ اور معیار زندگی کے بہتر ہو جانے کی وجہ سے قدرتی طور پر اس بات کے خواہشمند تھے کہ زیادہ صاف ستھری جگہوں میں رہیں۔ لہذا انہوں نے بعض ایسی زمینیں غیر معمولی قیمتوں میں خریدیں جنہیں یوروپینوں نے رد کر دیا تھا۔ یا جو یوروپینوں کے علاقوں کے قریب واقع تھیں۔ اگرچہ ۱۲۵۰۰۰ یوروپینوں کے مقابلہ میں ہندوستانیوں کی آبادی ۱۱۸۰۰۰ تھی۔ لیکن وہ خاص ڈربن میں جائیداد کے مجموعی رقبہ میں سے صرف ۲ فیصدی کے مالک تھے۔

پیگنگ بل!

لیکن یوروپینوں کا شور و غل بہت بڑھ گیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت ہند کے احتجاجوں کے باوجود ۱۹۴۳ء میں یونین کی پارلیمنٹ میں پیگنگ بل تیزی کے ساتھ منظور کرایا گیا۔ اس طرح پہلی مرتبہ نٹال میں

ایشیائیوں کے زمین حاصل کرنے پر قانونی پابندی عاید ہوئی۔ حکومت ہند اور جنوبی افریقہ کے ہندوستانیوں کے تازہ احتجاجوں سے متاثر ہو کر یونین کی حکومت نے اپریل ۱۹۴۴ء میں ایک تحقیقاتی کمیشن مقرر کیا۔ جو تیسرا بروم کمیشن کہلاتا ہے۔ تاکہ وہ ان معاملات کے متعلق تحقیقات کے بعد رپورٹ پیش کرے جن کا اثر صوبہ نٹال کے ہندوستانیوں پر پڑتا ہے۔ ہندوستانی کمیشن سے اشتراک عمل کرنے پر رضامند ہو گئے۔ اس کا نتیجہ نکلا کہ معاہدہ پریٹوریا ہوا۔ اس معاہدہ میں طے پایا تھا کہ پیگنگ بل کے بجائے نٹال پراونشل کونسل ایک آرڈیننس پاس کرے جس کے ذریعہ ایک لائسنس دینے والا بورڈ قائم کیا جائے۔ اس بورڈ کے دو یوروپین اور دو ہندوستانی ممبر ہوں۔ اور اس کا صدر ایک ایسا یوروپین بنایا جائے جو قانونی تعلیم رکھتا ہو۔

حکومت ہند کی رائے میں یہ ہندوستانیوں کے مسئلہ کا صحیح حل نہ تھا۔ مگر پھر بھی وہ اس پر رضامند ہو گئی کہ اس معاہدے کو آزما لیا جائے۔

یوروپینوں کے احتجاج کی وجہ سے پھر ایسا ہوا کہ جس مجلس منتخبہ کے سپرد یہ قانون کیا گیا تھا اس نے اس میں زبردست تبدیلیاں کر دیں۔ اور حکومت ہند نے اس کے متعلق یہ رائے ظاہر کی کہ اس مسودہ قانون میں کئی اہم امور کے لحاظ سے معاہدہ پریٹوریا کی خلاف ورزی کی گئی ہے۔

ہندوستان نے جوابی ایکٹ نافذ کیا!

جب یہ آرڈیننس پاس کیا گیا اور حکومت ہند کے احتجاج کو رد کر دیا گیا تو حکومت ہند نے اپنا جوابی ایکٹ نافذ کر دیا اور جنوبی افریقہ کے غیر ہندوستانی نسل کے باشندوں کو ہندوستان میں آباد ہونے کی ممانعت کر دی۔ اور اجازت نامہ لئے بغیر ان کو ہندوستان میں جائداد حاصل کرنے یا رکھنے کے حق سے محروم کر دیا۔

خوش قسمتی سے یونین کی حکومت نے آرڈیننس کو خلاف قانون قرار دیا اور ہندوستانی مسئلہ کا کوئی اور حل معلوم کرنے کا ارادہ ظاہر کیا۔

جون ۱۹۴۵ء میں یونین کی حکومت نے آبادی کے ہر طبقہ کے لئے جس میں ہندوستانی بھی شامل تھے بہتر مکانات کا انتظام کرنے کا قانون بنانا چاہا۔ مکانات کے (ہنگامی اختیارات) کا ایکٹ پاس ہو گیا۔ اور اس کی ایک دفعہ کے تحت نٹال پراونشل کونسل نے

(باقی شاہ ولی اللہ صاحب)

شاہ صاحب کی جان خطرے میں پڑ گئی۔ اور آپ کو مجبوراً ایک عرصہ کے لئے دہلی کو خیرباد کہنا پڑا۔ آخرکار شاہ صاحب کو اپنے مقصد میں کامیابی ہوئی۔ آپ نے لوگوں کو سمجھایا کہ قرآن مجید اس لئے نہیں آیا کہ اُسے ریشمی جزدانوں میں لپیٹ کر طاق میں تبرکاً رکھا جائے یا جس طرح دوسری قومیں منتر پڑھا کرتی ہیں اسے بھی طوطے کی طرح بغیر سمجھے پڑھ لیا جائے۔ بلکہ یہ کتاب انسانی زندگی کا دستور العمل ہے۔ اور زندگی کے تمام حقائق کو بے نقاب کرتی ہے۔ اور اس کے نزول کا مقصد یہ تھا کہ لوگ اس کو پڑھ کر سمجھیں اور ان حقائق کو اپنی زندگی کا دستور العمل بنائیں۔ آخرکار معترضین کی مخالفت ماند پڑ گئی اور نہ صرف شاہ صاحب کے فارسی ترجمے نے رواج پایا بلکہ اردو اور دوسری زبانوں میں ترجموں کیلئے بھی سہولت پیدا ہو گئی۔ قرآن کریم کا ترجمہ ہی اتنا اہم کام تھا کہ اگر شاہ صاحب اس کے سوا کچھ بھی نہ کرتے تو بھی اسلامی دنیا میں شاہ صاحب کا اسم گرامی رہتی دنیا تک درخشاں ستارے کی طرح چمکتا۔ اس سلسلہ میں ہم آپ کی بے مثال جرأت کی داد دیئے بغیر بھی نہیں رہ سکتے جو آپ نے مخالفین عصر کی غوغا آرائی کے مقابلہ میں دکھائی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ قرآن مجید کے موزوں ترجمے کے لئے جن خصوصیتوں کی ضرورت ہے وہ شاہ صاحب سے بڑھکر آج تک کسی مترجم میں جمع نہیں ہوئیں۔ مولانا نذیر احمد صاحب فرماتے ہیں۔

فی الحقیقت قرآن کے مترجم ہونے کے لئے جتنی باتیں درکار تھیں، ترجمے سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ سب شاہ صاحب میں علی وجہ الکمال پائی جاتی تھیں۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ حضرت شاہ صاحب کی نظر تفاسیر، احادیث اور دین کی کتابوں پر ایسی وسیع ہے کہ انہیں کا حصہ معلوم ہوتی ہے۔ ہر آیت بلکہ ہر لفظ کی نسبت مفسرین کے جتنے اقوال ہیں وہ سب ان کے پیش نظر ہیں۔ اور وہ ان میں سے جس کو واضح پاتے ہیں اسے اختیار کرتے ہیں۔

شاہ صاحب نے قرآن کریم کا ترجمہ کر کے اُسی پر بس نہیں کیا بلکہ اس مسئلہ کے علمی پہلوؤں پر بھی ایک رسالہ لکھا۔ اور مقدمہ فی ترجمۃ القرآن المجید میں قرآن کریم کے ترجموں کی رہنمائی کے لئے کارآمد باتیں درج کیں۔

شاہ صاحب اپنی ایک کتاب میں لکھتے ہیں کہ

خداوند عالم کا اس ضعیف انسان پر بڑا احسان ہے کہ اس نے مجھے قرآن مجید کے سمجھنے کی توفیق عنایت کی۔

علوم تفسیر پر شاہ صاحب نے جو کتابیں لکھی ہیں ان میں "الفوز الکبیر فی اصول التذکیر" خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ اس کتاب کے چار باب ہیں۔

پہلا باب علوم پنجگانہ کے بیان میں ہے شاہ صاحب قرآن مجید کے مضامین کو یوں ترتیب دیتے ہیں (ا) علم احکام (ب) علم مناظرہ یعنی یہود، نصاریٰ، مشرکین اور منافقین کی خصوصیات آپ نے بتایا ہے کہ آج بھی نام نہاد مسلمانوں میں ان فرقوں کی عادتیں موجود ہیں۔ اور قرآن کے ارشادات ان کے لئے مفید ہیں۔ (ج) علم التذکیر بآلاء اللہ (د) علم تذکیر بایام اللہ (ہ) علم تذکیر موت و بعد الموت۔

اس کتاب کے پڑھنے سے پتہ چلتا ہے کہ شاہ صاحب قرآن کے احکام کو وسیع سے وسیع مفہوم دینا چاہتے ہیں۔ وہ مختلف سورتوں اور آیتوں کے متعلق اسباب نزول کا خیال ضرور رکھتے ہیں۔ لیکن اس بات کا بھی خیال رکھتے ہیں کہ ایسا کرنے پر قرآن کریم کے اصلی مقصد پر پردہ نہ پڑ جائے۔ چنانچہ آپ باب اول میں لکھتے ہیں۔ "عام مفسرین نے ہر ایک آیت کو خواہ مباحثہ کی ہو یا احکام کی ایک قصے کے ساتھ مربوط کیا ہے۔ اور اس قصے کو اس آیت کے لئے سبب نزول قرار دیا ہے۔ لیکن حق بات یہ ہے کہ قرآن کے نزول سے مقصود اصلی نفوس بشریہ کی تہذیب اور ان کے باطل عقائد اور فاسد اعمال کی تردید ہے۔ بہرحال خاص واقعات جن کے بیان کرنے کی تکلیف اُٹھائی گئی ہے ان کو اسباب نزول میں چنداں دخل نہیں۔ مگر سوائے معدودے چند واقعات کے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں یا اس سے پیشتر واقع ہوئے ہیں۔

(م ۔ ا)

(باقی جنوبی افریقہ)

نٹال ہاؤسنگ آرڈیننس نافذ کیا۔ مختلف مدارج پر ہندوستانی ہائی کمشنر اور ہندوستانی آبادی کے نمائندوں سے صلاح و مشورہ کیا گیا۔ چونکہ انتظامی طور پر یقین دلا دیا گیا تھا کہ نئے آرڈیننس سے موجودہ ہندوستانی مفادات کو کسی طرح بھی نقصان نہ پہنچے گا۔ اس لئے حکومت ہند نے بھی چپ چاپ مان لیا۔ حکومت ہند سے اشارتاً یہ بھی کہا گیا تھا کہ ۳۱ مارچ ۱۹۴۶ء کے بعد پیگنگ ایکٹ (حد بندی کا قانون) ختم کر دیا جائے گا۔ حکومت ہند کو توقع تھی کہ زمینوں کے متعلق ہندوستانی حقوق کا مسئلہ حل کرنے کے لئے یہ امور کافی ثابت ہوں گے۔

ایشیاٹک لینڈ ٹینیور بل!

اس وجہ سے ڈرافٹ ایشیاٹک ٹینیور اور انڈین ریپریزنٹیشن بل کی بابت سن کر بڑی حیرت ہوئی۔ حکومت ہند کی رائے میں یہ بل پیگنگ ایکٹ کی بہ نسبت کئی لحاظ سے زیادہ برا ہے۔ کیونکہ اس ایکٹ کا اطلاق شہری علاقوں میں سکونتی زمین پر ہوتا تھا۔ مگر موجودہ بل کا اطلاق شہری اور دیہی علاقوں میں ہر طرح کی زمینوں پر ہوتا ہے جس میں زرعی زمینیں بھی شامل ہیں۔ حکومت ہند کا خیال ہے کہ اس کی وجہ سے نٹال اور ٹرانسوال بھر میں ہر قسم کی شہری اور دیہی زمینوں پر پیگنگ ایکٹ کے شرائط مستقل طور سے نافذ ہو جائیں گے۔ حق رائے دہی فرقہ وارانہ بنیاد پر دیا گیا ہے۔ اس سے نٹال پراونشل کونسل کے علاوہ جہاں ہندوستانی بھی نمائندگی کر سکتا ہے ہر جگہ کی نمائندگی یورپینوں کو حاصل ہوگی۔

حکومت ہند نے کہا کہ اس بل کو قانون کی شکل دینا ملتوی کر دیا جائے۔ اور جیسی کہ تیسرے براڈم کمیشن نے سفارش کی تھی (یہ واحد سفارش تھی جو کمیشن نے کی تھی) یونین کی حکومت سے استدعا کی کہ کوئی اور حل معلوم کرنے کے لئے ہندوستانیوں کے نمائندہ وفد کو باریاب کیا جائے۔ یہ تجویز مسترد کر دی گئی اور بل کو پارلیمنٹ سے پاس کرا لیا گیا۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد سے جو جدید بین الاقوامی مطمح نظر پیدا ہوا ہے اس کی بنا پر یہ رد یہ بالکل غیر منصفانہ ہے۔ حکومت ہند کو نوٹس دینا پڑا کہ یونین کی حکومت کیساتھ جو تجارتی معاہدہ تھا وہ ختم کر دیا گیا۔ جنوبی افریقہ کے ہندوستانیوں کی کانگریس کا ایک وفد حکومت اور باشندگان ہند کی امداد حاصل کرنے کے لئے ہندوستان میں موجود تھا۔

وقائع علما

وزارتی مشن کا نتیجہ خیز اعلان!

دہلی۔ ۲۰ جون۔ آج وزارتی مشن نے ہندوستان کے لوگوں کو بتایا ہے کہ جہاں کانگریس اور مسلم لیگ نے طویل عرصہ والی آئینی شرائط منظور کرلی ہیں وہاں عارضی گورنمنٹ میں عدم اتحاد کی وجہ سے جو دشواری پیدا ہوگئی ہے اس کے لئے یہ تجویز کیا گیا ہے کہ فی الحال اس مسئلہ کو ملتوی رکھا جائے۔ اور جب فضا کچھ صاف ہوجائے تو پھر مفاہمت کی کوشش کی جائے، اور اس درمیان میں کام چلانے کے لئے سرکاری افسروں سے بدستور کام لیا جائے۔

وزیروں کی روانگی!

دہلی۔ اعلان کیا گیا ہے کہ وزارتی مشن اپنا کام ختم کرنے کے بعد سنیچر کو انگلستان روانہ ہو رہا ہے جہاں پہنچ کر وہ کیبنٹ اور پارلیمنٹ کے سامنے اپنی کارگذاریوں کی رپورٹ پیش کرے گا۔

سردار پٹیل کی آمد

بھوپال۔ معلوم ہوا ہے کہ ہز ہائینس کی دعوت پر مشہور کانگریسی لیڈر سردار پٹیل یہاں تشریف لائے ہیں۔ مذاکرات کے متعلق ابھی کوئی اطلاع نہیں ملی۔

کانگریس عارضی حکومت میں شریک ہوجائیگی

امرتسر۔ اکالی لیڈر ماسٹر تارا سنگھ نے ایک بیان میں کہا ہے کہ سکھ وزارتی مشن کی تجویز کے خلاف برابر جدوجہد جاری رکھیں گے۔ کیونکہ یقین ہے کہ کانگریس آگے چلکر عارضی حکومت میں ضرور شریک ہوجائیگی

مفتی اعظم کو تمام حقوق دیئے جائیں!

شاہ فاروق سے مطالبہ

قاہرہ۔ انجمن اخوان المسلمین نے جس کا صدر دفتر قاہرہ میں ہے شاہ فاروق والی مصر کو ایک یادداشت ارسال کی تھی۔ اس میں یہ مطالبہ کیا گیا ہے کہ حکومت مصر مفتی اعظم فلسطین کو ان کے جملہ حقوق اور ان کی آزادی کو بحال کرانے کے لئے فوری کارروائی کرے۔ تاکہ مفتی اعظم اسلامی دنیا اور اسلام کے ایک بڑے رہنما کی حیثیت سے اپنے فرائض انجام دے سکیں۔

(بقیہ صفحہ ۱۱)

شہنشاہ اورنگ زیب نے سلطان عبد الحمید کے ساتھیوں کے پکڑے جانے پر ترکی حکومت پر سخت ناراضگی کا اظہار کیا اور یہی روایت آج تک ہندوستان کے مسلمان قائم رکھے ہوئے ہیں۔ اینگلو ڈچ سازش جو انڈونیشیا کے مسلمانوں کے خلاف جاری ہے ہندوستان کے دس کروڑ مسلمان اس پر سخت ناراضگی اور غصہ کا اظہار کرتے ہوئے احتجاج کرتے ہیں اسی طرح دنیا کے اور دوسرے اسلامی ممالک بھی اس ظلم اور ناانصافی پر برانگیختہ ہیں۔ جارحانہ عمل دخل کو ان سے پوری طرح ختم ہونا چاہئے ورنہ وہ اپنی پچھلی دوستی کی روایت جو ہندوستان مصر ایران افغانستان عرب ترکی اور دوسرے اسلامی ممالک سے وابستہ ہے کھو بیٹھیں گے جنھوں نے جانی مالی غرض ہر طرح سے برطانیہ کو اسکی مصیبت کے دنوں میں امداد پہنچائی ہے۔

(بقیہ صفحہ ۱۲)

دارالمطالعہ کے پاس کھڑا تھا میں ہنسنے لگی۔

اسیوقت کوئی لائبریری کی طرف سے بے تحاشہ سائکل دوڑاتا ہوا آیا۔ تقریباً ۲۲ یا ۲۳ سال کی عمر بال پریشان۔ سر سے ٹوپی غائب۔ کوٹ اور پتلون پہنے سائکل پر چلا آرہا تھا گیتا چونک اٹھی۔ دیکھنا۔ اس نے کہا یہی ہریش چندر ہے لائبریری کے پاس وہی ہی موٹر ہے۔ اور پھر اس نے گیتا کو دیکھکر جو بریک لگایا تو سائکل الٹ گئی۔ بارش سے بھیگی بھیگی کولتار کی چکنی سڑک بے چارہ بری طرح گرا۔ میرا اور مس گیتا کا قہقہہ نکل گیا۔ اور نیم۔ یا نصف ڈاکٹر ہریش چندر شرمندہ ہوکر بھاگے۔ سائیکل کی اس ناوقت پھسلن نے انکا سارا رومان ختم کردیا میں نے دیکھا

رہگذر نہ ہنسنے والی گیتا کی ہنسی آج رکے نہ رک رہی تھی۔

خلیل بدر۔ ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر نے سینٹرل انڈیا پریس بھوپال میں چھپواکر دفتر "الحمرا" بھوپال سے شائع کیا۔

شیراز
کا
ایک
نو تعمیر
قدیم
مقبرہ